اصلاحِ معاشرہ کا قرآنی تصوّر

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

مکتبہ خُدّامُ القُرآن لاہور

36 کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون : 3-35869501

maktaba@tanzeem.org

مؤسس انجمن خدام القرآن جناب ڈاکٹر اسرار احمد ؒ کی اپنی دلی خواہش اور جدوجہد کے تقاضوں کے عین مطابق' مرحوم کے تمام قانونی وارثین ہر مسلمان کو ڈاکٹر صاحبؒ کی طبع شدہ تصنیفات/ تالیفات' آڈیوز' ویڈیوز کو طبع/ تیار کر کے شائع کرنے کی کھلی اجازت دیتے ہیں (چاہے قیمتاً ہو یا مفت تقسیم) اور اس کے لیے کسی پیشگی اجازت کی ضرورت نہیں۔ ہمارا کسی قسم کی رائلٹی یا ''محفوظ حقوق'' کا تقاضا بھی نہ ہے اور نہ ہوگا' البتہ تیار کردہ مواد (آڈیوز یا ویڈیوز) اور کتب کے چند نسخے ہمارے ریکارڈ کے لیے بھیج دیے جائیں تو ممنون ہوں گے۔ تاہم ان میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کی ناپسندیدہ کوشش مثلاً تبدیلی الفاظ' غلط اقتباس' سیاق وسباق سے الگ کر کے جملے کا حوالہ یا اس کا ایسا استعمال جس سے ڈاکٹر صاحب مرحوم اور ہمارے موقف کی صحیح ترجمانی نہ ہو اور جس سے ہماری عزت وشہرت پر حرف آئے' تو ہم اس شخص کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا مکمل حق محفوظ رکھتے ہیں۔

نام کتاب ——— اصلاحِ معاشرہ کا قرآنی تصور

طبع اوّل (نومبر 2018ء) ——— 2200

ناشر ——— ناظم نشرواشاعت' مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت ——— 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور

فون: 35869501-3

مطبع ——— شرکت پرنٹنگ پریس' لاہور

قیمت ——— 160 روپے

ISBN : 978 - 969 - 606 - 056 - 7

email:publications@tanzeem.org
website:www.tanzeem.org

عرضِ ناشر

پیش نظر کتاب بانیٔ تنظیم اسلامی وداعی رجوع الی القرآن ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے تین خطابات پر مشتمل ہے۔ محترم ڈاکٹر صاحبؒ نے مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور میں ۵ نومبر اور ۱۲ نومبر ۱۹۸۲ء کے خطاباتِ جمعہ میں ''اصلاحِ معاشرہ کا قرآنی تصور'' کے موضوع پر بڑے شرح وبسط کے ساتھ اظہارِ خیال فرمایا تھا۔ مزید برآں ۱۲ نومبر ہی کو بعد نماز مغرب جناح ہال لاہور میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی تاسیس کی دس سالہ تقاریب کا افتتاحی اجلاس منعقد ہوا تھا' جس کی صدارت مولانا سید وصی مظہر ندویؒ (مہتمم مدرسہ عربیہ اسلامیہ حیدرآباد اور میئر بلدیہ حیدرآباد) نے فرمائی تھی اور مہمان خصوصی جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰنؒ (چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل) تھے۔ اس اجلاس میں جناب ڈاکٹر صاحبؒ نے اصلاحِ معاشرہ کے ضمن میں اپنے سلسلۂ خطابات کا تیسرا اور آخری حصہ ''اصلاحِ معاشرہ کا انقلابی پہلو'' کے عنوان سے پیش فرمایا' کہ اگر ظالمانہ' جابرانہ اور استحصالی نظام کو بدلنے کے لیے صحیح نہج پر اسلامی انقلاب کی جدوجہد نہ کی گئی تو اصلاحِ معاشرہ کے لیے اوپر کی لیپاپوتی سے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوگا۔

ان تینوں خطابات کو شیخ جمیل الرحمٰن صاحبؒ نے کیسٹ سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر کے ترتیب وتسوید کے بعد بالاقساط ماہنامہ میثاق کے صفحات کی زینت بنایا۔ موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اس سلسلۂ خطابات کو نظرثانی' ذیلی عنوانات کے اضافے اور احادیث کی تخریج کے بعد بارے دگر 'میثاق' (نومبر ۲۰۱۶ء تا جون ۲۰۱۷ء) میں شائع کیا گیا' اور اب ان خطابات کو یکجا کر کے کتابی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس خدمتِ قرآنی کو محترم ڈاکٹر صاحب اور شیخ جمیل الرحمٰن رحمہما اللہ تعالیٰ کے لیے صدقۂ جاریہ اور ہم سب کے لیے دنیوی واخروی فوز وفلاح کا باعث بنائے ـــــ آمین!

حافظ خالد محمود خضر

مدیر شعبہ مطبوعات

ترتیب

خطاب ① اصلاحِ معاشرہ کا قرآنی تصوّر	**07**
اصلاحِ معاشرہ کی جڑ اور چوٹی	7
تعمیرِ سیرت و کردار کا تعلق جذبات سے!	9
ارادہ اور قوتِ ارادی کی اہمیت	10
علم کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے!	12
انسانی جذبات کی دو نوعیتیں: جذبۂ محبت اور جذبۂ خوف	13
تعمیرِ سیرت و کردار میں حُبِّ الوطنی و قوم پرستی کی اہمیت	14
تعمیرِ سیرت و کردار میں 'نظریہ حُبِّ انسانی' بلند تر ہے!	17
اسلام میں تعمیرِ سیرت و کردار کی اولین بنیاد: محبتِ الٰہی	19
ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت: ایمان باللہ کی فروع	21
تعمیرِ سیرت و کردار کی بنیاد ثانی: حُبِّ رسول ﷺ	23
تعمیرِ سیرت و کردار کی بنیاد ثالث: حُبِّ جہاد	24
منفی اور ہوائے نفس کی محبتوں سے پرہیز	27
انسانی جذبات کی دوسری نوعیت: جذبۂ خوف	30
اسلام کا تعزیراتی نظام اور اس کے اصول	31
حدود و تعزیرات کی حکمت: عبرت پذیری اور سبق آموزی	32
مؤثر ترین خوف: خوفِ آخرت	33
قرآن مجید میں انذارِ آخرت کی مثالیں	36
بعث بعد الموت پر کفار کے اعتراضات	38
اعتراضاتِ کفار کے جوابات	40
تعمیرِ سیرت و کردار کے لیے ناگزیر: حُبِّ الٰہی اور خوفِ آخرت	41
''ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب!''	43
اصلاحِ معاشرہ کے لیے دو حکومتی اقدامات کی ضرورت	45

خطاب ② اصلاحِ معاشرہ کا قرآنی تصوّر	**47**
اصلاحِ معاشرہ کی تین سطحیں	47
جذبے اور ارادے کی اہمیت	49
تعمیرِ خودی اور جذبۂ محبت	50
انسانیت اور نظریے کی محبت	52
اسلام میں انسانی جذبات کی ارفع ترین سطح	53
خوف وانذار مؤثر ترین جذبہ ہے!	56
محاسبۂ اخروی کا خوف	59
خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا خوفِ آخرت	61
شفاعت کا تصور: قرآنی آیات کی روشنی میں	62
شفاعت کا تصور: احادیث کی روشنی میں	66
تعمیرِ سیرت وکردار کے لیے حقیقی ایمان ناگزیر ہے	67
ایمان کے ذرائع	67
ایمان کا پہلا منبع: صحبتِ صاحبِ یقین	68
ایمان کا دوسرا منبع: قرآن مجید	71
نورِ قرآن، تمام ظلمتوں کو دور کرنے والا ہے	72
چودھویں صدی کی دو عظیم شخصیتیں: شیخ الہندؒ اور علامہ اقبال	76
اَمراضِ اُمتِ مُسلمہ کا واحد علاج: رجوع الی القرآن	78
اذہان وقلوب میں قرآن مجید کا نفوذ کیسے ہو؟	82
حکومتی سطح پر اصلاحِ معاشرہ کے مؤثر ترین ذرائع	83
ہمارے نصابِ تعلیم کی زبوں حالی	88
افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر	91
ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کی فکر اور ان کی جِدّوجُہد	92
دعوت رجوع الی القرآن کا آغاز	94
مرکزی انجمن خُدّام القرآن کا قیام	95
مرکزی انجمن خُدّام القرآن کے قیام کا مقصد	97

خطاب ③ اصلاحِ معاشرہ کا انقلابی پہلو 101

اصلاحِ معاشرہ کی چوٹی 104

تمیز بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے 106

مُستضعفین اور مُستکبرین کا مکالمہ 109

قرآن کا مرکزی پیغام: نظامِ عدل وقسط کا قیام 111

بعثتِ انبیاء ورسل علیہم السلام کا مقصد 112

بعثتِ محمدی ﷺ کی غرض وغایت 114

بعثتِ محمدی ﷺ کی تکمیلی شان 116

نظامِ عدل وقسط کی اہمیت اور اس کی برکات 118

اصلاحِ معاشرہ اور نظامِ عدل وقسط کا باہمی تعلق 120

اصلاحِ معاشرہ کے لیے انقلاب ناگزیر ہے! 125

انقلابی عمل کے لوازم ومراحل 126

اسلامی انقلاب کے مراحل 128

اسلام کا نظریۂ انقلاب: ''قرآن مجید'' 129

اسلامی انقلاب کے لیے قرآن حکیم کی اصطلاحات 131

انقلابِ محمدی ﷺ کی اساس وبنیاد 136

تربیت اور تزکیۂ نفس کا ذریعہ: قرآن عظیم 138

روحانی وباطنی امراض اور ان کا علاج 140

قرآن کی ناقدری پر علامہ اقبال کا مرثیہ 142

تمام امراض کا علاج قرآن مجید ہے! 144

محمد رسول اللہ ﷺ پر تکمیلِ نبوت کا تقاضا 147

قرآن ہی ''حبل اللہ'' ہے! 149

مسلمانوں کا احیاء: احیائے قرآن سے وابستہ! 151

جماعت اور تنظیم کی ضرورت واہمیت 156

انقلاب کے تکمیلی مراحل 157

خطاب ①

اصلاحِ معاشرہ کا قرآنی تصور

۲۹/اکتوبر ۱۹۸۲ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اعوذ باللّٰہ من الشّیطٰن الرّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰی فِیۡ سُوۡرَةِ الۡبَقَرَةِ :

﴿وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ؕ﴾ (آیت ۱۶۵)

وَقَالَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ فِیۡ سُوۡرَةِ التَّوۡبَةِ:

﴿قُلۡ اِنۡ كَانَ اٰبَآؤُكُمۡ وَاَبۡنَآؤُكُمۡ وَاِخۡوَانُكُمۡ وَاَزۡوَاجُكُمۡ وَعَشِیۡرَتُكُمۡ وَاَمۡوَالُ ۨاقۡتَرَفۡتُمُوۡهَا وَتِجَارَةٌ تَخۡشَوۡنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرۡضَوۡنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَیۡكُمۡ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوۡلِهٖ وَجِهَادٍ فِیۡ سَبِیۡلِهٖ فَتَرَبَّصُوۡا حَتّٰی یَاۡتِیَ اللّٰہُ بِاَمۡرِهٖ ؕ وَاللّٰہُ لَا یَهۡدِی الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِیۡنَ ﴿۲۴﴾﴾

وَقَالَ اللّٰہُ سُبۡحَانَهٗ وَتَعَالٰی فِیۡ سُوۡرَةِ الۡعَلَقِ :

﴿كَلَّاۤ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَیَطۡغٰۤی ﴿۶﴾ اَنۡ رَّاٰهُ اسۡتَغۡنٰی ﴿۷﴾ اِنَّ اِلٰی رَبِّكَ الرُّجۡعٰی ﴿۸﴾﴾

صَدَقَ اللّٰہُ مَوۡلَانَا الۡعَظِیۡمُ

رَبِّ اشۡرَحۡ لِیۡ صَدۡرِیۡ وَیَسِّرۡ لِیۡ اَمۡرِیۡ وَاحۡلُلۡ عُقۡدَةً مِّنۡ لِّسَانِیۡ یَفۡقَهُوۡا قَوۡلِیۡ، اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اَلۡهِمۡنَا رُشۡدَنَا وَاَعِذۡنَا مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا، اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الۡحَقَّ حَقًّا وَّارۡزُقۡنَا اتِّبَاعَهٗ وَاَرِنَا الۡبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارۡزُقۡنَا اجۡتِنَابَهٗ، آمِیۡنَ یَا رَبَّ الۡعَالَمِیۡنَ ○

اصلاحِ معاشرہ کی جڑ اور چوٹی

حضرات! آپ کے علم میں ہے کہ اس وقت ہمارے ملک میں سرکاری اور نیم سرکاری دونوں سطحوں پر اصلاحِ معاشرہ کی مہم جاری ہے۔ اس سے قطع نظر کہ یہ مہم اکثر و بیشتر صرف

کاغذی ہے' یہ چند محافل و مجالس میں تقریروں کے موضوع کی شکل میں اور پھر اخبارات میں خبروں کی صورت میں نظر آتی ہے' اس معاملے کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ اس مہم کا نہ کوئی سر ہے نہ پیر۔ میں یہ الفاظ جان بوجھ کر استعمال کر رہا ہوں۔ سر سے میری مراد کیا ہے اور پیر سے میری مراد کیا ہے اور ان دونوں کا اس مہم میں موجود نہ ہونا میرے نزدیک کیا معنی رکھتا ہے؟ آج اسی ضمن میں مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ اصلاحِ معاشرہ کا پیر یا اس کی جڑ اور اساس 'تعمیرِ کردار' ہے۔ افراد کی شخصیتوں کی تعمیر کے لیے جو مثبت اساس ضروری ہے اگر وہ فراہم نہ کی جا رہی ہو' اس پر توجہ نہ دی جا رہی ہو' اس پر نگاہیں مرکوز نہ ہو رہی ہوں تو ظاہر بات ہے کہ مہم چاہے کتنے ہی جوش و خروش سے اُٹھائی گئی ہو اور لوگ اس ضمن میں کتنی ہی توانائی اور کتنا ہی وقت صرف کر رہے ہوں' ایسی تمام کوششیں بالکل بے بنیاد ہیں اور ان کی کوئی جڑ اور اساس نہیں ہے۔ سر کے مفہوم میں جو بات میرے پیشِ نظر ہے' وہ یہ ہے کہ کسی معاشرے میں اگر نظام صالح اور عادلانہ نہ ہو اور اس وجہ سے لوگوں میں سکون و اطمینانِ قلب کی کیفیات اور تعمیری و مثبت احساسات و جذبات پیدا ہونے کے بجائے نفرت' بغض' عداوت اور انتقام کے جذبات پرورش پا رہے ہوں تو اس نظام میں اصلاحِ معاشرہ کی کسی مہم اور کوشش کے کامیاب ہونے کا کوئی امکان سرے سے موجود نہیں ہوتا۔

میرے نزدیک اصلاحِ معاشرہ کی جڑ اور بنیاد ہے تعمیرِ سیرت و کردار کی مثبت کوشش' اور اس کی چوٹی یہ ہے کہ معاشرے میں جو نظام قائم ہو وہ عادلانہ ہو اور مبنی بر قسط و انصاف ہو۔ اس میں اطمینان و سکون کی کیفیات موجود ہوں اور اس نظام کے تحت زندگی گزارنے والوں کے اذہان و قلوب انتقامی اور نفرت و عداوت کے منفی جذبات سے نہ صرف پاک ہوں بلکہ ان جذبات کے بجائے ان میں تعمیری و مثبت احساسات جاگزین ہوں۔ ان دونوں کے مابین ایک درمیانی سطح ہے جس کے پیشِ نظر کچھ نہ کچھ کرنے کی کوشش ہو رہی ہے' اور وہ ہے اوامر و نواہی کا ایک نظام اور تعزیر و تادیب اور احتساب کا ایک قانونی سلسلہ۔ یہ کام بھی یقیناً اصلاحِ معاشرہ میں مدد ہوتا ہے اور اس کی بھی ضرورت ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ درمیانی شے ہے' اور جب تک تعمیرِ کردار کی تعمیری و مثبت کوشش نہ ہو اور جب تک معاشرے میں ایک عادلانہ نظام قائم نہ کیا جائے' اُس وقت تک محض یہ دار و گیر' تعزیر و تادیب' احتساب اور اوامر و نواہی کے صرف نعروں اور slogans سے پیشِ نظر اصل مقصود حاصل نہیں ہو سکتا۔

اصلاحِ معاشرہ کے لیے میں نے جن امور کو سر اور پیر سے تعبیر کیا ہے یا جن کو چوٹی اور بنیاد قرار دیا ہے' اس کو اجمالی طور پر تو میں نے بیان کر دیا ہے' لیکن اس اجمال سے یہ مسئلہ پوری طرح واضح نہیں ہوتا۔ اس کا خود مجھے بھی احساس ہے اور یقیناً آپ حضرات کو بھی ہو گا' لہٰذا اب میں اس اجمال کو اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق کے بھروسے پر قدرے تفصیل سے آپ کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ آپ حضرات سے میری درخواست ہے کہ میری معروضات پر اپنی توجہات کو مرکوز رکھیے۔

تعمیرِ سیرت و کردار کا تعلق جذبات سے!

عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تعمیر سیرت و کردار کا انسان کی عقل یا فکر یا اس کے ذہن سے شاید زیادہ تعلق ہے' حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ تعمیر سیرت و کردار کا اصل تعلق انسان کے جذبات سے ہے۔ جذبات اگر صحیح رُخ اختیار کریں گے اور صحیح نہج پر اُبھریں گے تو کردار صحیح ہو گا' ورنہ بسا اوقات جو کچھ ہوتا ہے وہ میرے اور آپ کے مشاہدے بلکہ ذاتی تجربے کی بات ہے کہ ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد　　پر طبیعت اِدھر نہیں آتی!

جبلی و فطری اور شعوری طور پر انسان نیکی اور بدی کی تمیز رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ بھلائی کیا ہے اور برائی کیا ہے' خیر کیا ہے اور شر کیا ہے؟ پھر ذرائع ابلاغ کے ذریعے کسی نہ کسی درجہ میں یہ بات پھیلائی جاتی رہتی ہے کہ یہ خیر ہے' یہ شر ہے' یہ بھلائی ہے' یہ بُرائی ہے۔ محراب و منبر سے بھی اس کی تلقین و تبلیغ ہوتی رہی ہے اور اب بھی ہو رہی ہے۔ اسی طریقے سے اگر حکومت کے ایوانوں سے بھی اس کی نشر و اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے تو بہر حال یہ بھی اپنی جگہ پر ایک مفید بات اور کام ہے۔ لیکن اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ لوگ جانتے نہیں ہیں کہ رشوت لینا اور دینا برا ہے۔ اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو معلوم نہیں ہے کہ جھوٹ بولنا' غیبت کرنا' بہتان لگانا برائی ہے۔ اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو علم نہیں ہے کہ خیانت' سرقہ' قمار' زنا بُری شے ہیں' وعدہ خلافی بری بات ہے' دھوکہ دینا برائی ہے' ملاوٹ' ذخیرہ اندوزی' بلیک مارکیٹنگ' اسمگلنگ اور اسی نوع کی اخلاقی اور معاشرتی خرابیاں بدی ہیں۔ بھلائی بہر حال نہیں ہیں۔ کوئی بھی ان باتوں کو ذہناً اور شعوری طور پر اچھا نہیں سمجھتا' لیکن بات وہی ہے کہ بقولِ غالب ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد　　پر طبیعت اِدھر نہیں آتی!

اصل مسئلہ یہ ہے کہ برائیوں کو چھوڑنے اور اچھائیوں کو اختیار کرنے پر طبیعت آمادہ نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ برائیوں میں لذت بھی ہے اور منفعت بھی (۱)۔ قرآن حکیم کا فلسفہ تو یہ ہے کہ خیر و شر اور نیکی و بدی کی تمیز اور شعور فطرتِ انسانی میں موجود ہے۔ تمیز و امتیاز کی یہ صلاحیت و اہلیت اللہ تعالیٰ نے انسان کو الہامی و وجدانی طور پر عطا کی ہے۔ یہ علم اس کی جبلت و فطرت میں ودیعت شدہ ہے۔ چنانچہ سورۃ الشمس میں اس حقیقتِ کبریٰ کو بایں الفاظ بیان فرمایا گیا ہے:

﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝۷ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝۸﴾

''اور قسم ہے نفس انسانی کی اور اُس ذات کی جس نے اُسے سنوارا' پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اس پر الہام کر دی۔''

ارادہ اور قوتِ ارادی کی اہمیت

اصل اور اہم ترین سوال یہ ہے کہ وہ کون سی چیز ہے جو انسان کو خیر' نیکی اور بھلائی کو اختیار کرنے پر آمادہ کرے' درآں حالیکہ اُسے خیر کو اختیار کرنے کی وجہ سے فوری طور پر کوئی تکلیف یا نقصان پہنچ رہا ہو! اور کون سا وہ جذبہ ہے جو اُسے شر' بدی اور بُرائی سے اجتناب کرنے پر آمادہ کرے' درآں حالیکہ اس سے اس کو فوری طور پر کوئی منفعت یا لذت حاصل ہو رہی ہو! ان تمام محرکات کے برعکس انسان کے جذبے کو مہمیز کرنے اور ارادے کو تقویت دینے والی شے کیا ہے؟ اس ضمن میں بڑی پیاری بات ہے جو علامہ اقبال مرحوم نے اپنے فلسفۂ تعلیم کے ذیل میں کہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''نظامِ تعلیم میں اصل شے جو مطلوب ہے وہ عقل اور ذہن کی تربیت نہیں ہے' عقل اور ذہن کے اندر تو نمو اور ظہور کی خلقی (inherent) صلاحیت موجود ہے۔''

ان کی اس رائے کے ضمن میں یہ بات جان لیجیے کہ وہ علم جو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو عطا فرمایا تھا ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ (البقرۃ:۳۱) یہ درحقیقت اُس کا ظہور (exposure) ہے جو بہرحال ہونا ہی تھا۔ یہ تمام مادّی علوم' یہ تمام ٹیکنالوجی اور یہ تمام فزیکل سائنسز دراصل ان تمام کا علم بالقوّہ (potentially) حضرت آدم علیہ السلام کو دے دیا گیا تھا' جس کا تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کی ترقی و ارتقاء کے ساتھ ساتھ نمو اور ظہور ہوتا چلا آ رہا ہے' جس کے لیے میں انگریزی کا لفظ exfoliation استعمال کرتا ہوں۔ جیسے ایک بند کلی ہے'

---

(۱) جیسے صحیح بخاری کی حدیث میں آیا ہے: حُجِبَتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ (مرتب)

اس میں بالقوہ پتیاں اور پھول موجود ہے' لیکن جب وہ کھلتی ہے تو پتیوں اور پھول کا ظہور ہوتا ہے۔ پس یہ علم تو انسانیت کو عطا ہو چکا تھا' لیکن اس کو تدریجاً ظہور پذیر ہونا تھا۔ جیسے کلی سے غنچہ اور پھر اس سے پھول بننے کے مدارج کی مثال ہے۔ اس کی دوسری مثال بیج اور درخت کی ہے کہ بیج میں بالقوّہ درخت موجود ہوتا ہے' لیکن پورا درخت بننے میں وقت لگتا ہے۔ چنانچہ یہ شے تو انسان میں پہلے سے ہی موجود تھی اور اسے بروئے کار آنا ہی تھا۔

علامہ اقبال مرحوم آگے کہتے ہیں کہ ''نظامِ تعلیم کی اصل ضرورت یہ ہے کہ وہ انسان میں ارادہ و عزم کی ایک کیفیت پیدا کرے اور قوتِ ارادی کی تربیت کرے''۔ مجھے یقین ہے کہ علامہ مرحوم کی اس بات سے آپ کا ذہن علامہ کی اردو اور فارسی کی شاعری کی اس خصوصیت کی طرف منتقل ہو گیا ہو گا جس کو انہوں نے ''تعمیرِ خودی'' سے تعبیر کیا ہے۔ ''تعمیرِ خودی'' یعنی انسان کے ارادے اور اس کی عزیمت کی تربیت اس نوع سے کہ جس چیز کو وہ صحیح اور درست سمجھتا ہے' اس پر اسے استقامت حاصل ہو' اور جس چیز کو وہ سمجھتا ہے کہ غلط ہے اس سے وہ رُک سکے' خواہ اس میں کوئی تکلیف آ رہی ہو اور خواہ وہ چیز اس کے لیے فوری طور پر کتنی ہی نقصان دہ بن رہی ہو۔ پس تربیتِ ارادہ ہی کو علامہ مرحوم نے اپنی شاعری میں تعمیرِ خودی سے تعبیر کیا ہے۔

اب ذرا ذہن میں لائیے کہ ہمارے یہاں تعمیرِ کردار کا جو عظیم نظام ایک طویل عرصے سے جاری رہا ہے' جسے عام طور پر ''تزکیۂ نفس'' کے نظام سے موسوم کیا جاتا ہے' وہ بڑا مؤثر نظام تھا۔ یہ نہ سمجھئے کہ وہ کوئی بے بنیاد شے تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے ایسے ادارے (institutions) اِلا ماشاء اللہ' بگاڑ (corruption) کا شکار ہو گئے' ان میں فساد رونما ہو گیا۔ ہم میں سے اکثر و بیشتر لوگوں نے تو اسلام کی عظیم عبادات کو بھی محض رسومات بنا کر رکھ دیا ہے۔ بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

رہ گئی رسمِ اذاں رُوحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی!

تو اس طرح ہمارا وہ نظامِ تربیت اور ہمارے وہ ادارے بھی اس وقت اپنی اصل اور جڑ سے ہمیں ہٹے ہوئے نظر آ رہے ہیں' اِلا ماشاء اللہ' تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ادارے ہی بے بنیاد اور بے اصل تھے۔ ہمارے ہاں اصلاحِ اخلاق' تزکیۂ نفس اور تعمیر و تربیت خودی کا جو

نظام رائج رہا ہے اور اب بھی جیسے تیسے جاری ہے' یاد ہے کہ اس کا نقطۂ آغاز کیا لفظ ہے؟ وہ ہے ''مرید''۔ طلبِ ہدایت اور رہنمائی کے مقصد کے لیے کسی شخص کی طرف رجوع کرنے والا مرید ہوتا ہے۔ مرید کے معنی ہیں: ارادہ کرنے والا۔ جس نے عزم و ارادہ کیا ہے کہ وہ ہدایت کی راہ پر چلے گا۔ انسان جانتا تو ہے کہ خیر یہ ہے اور شر یہ ہے' بھلائی یہ ہے اور برائی یہ ہے۔ لیکن اس کی اصل ضرورت یہ ہے کہ اس میں ایک ارادہ وجود میں آجائے' پھر اس ارادے کو تقویت حاصل ہو' اس کی قوتِ ارادی مضبوط ہوتا کہ وہ خیر کی طرف پیش قدمی کر سکے' اگرچہ اس میں دشواری اور مشکل درپیش ہو۔ جیسے کہ حدیث شریف میں الفاظ آئے ہیں: حُجِبَتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ(۲) ''جنت بہت سی ناگوار چیزوں سے گھیر دی گئی ہے''۔ جنت کے حصول کے لیے بڑھنا ہو تو بڑی ناگوار کیفیات اور ناپسندیدہ مشکلات سے سابقہ پیش آکر رہے گا۔ نفس پر شاق گزرنے والی باتوں اور کاموں سے واسطہ پڑ کر رہے گا۔ آگ اور خون کی وادیوں ہی سے گزر کر انسان جنت تک پہنچ سکتا ہے۔ کوئی ٹھنڈی سڑک جنت کی طرف لے جانے والی نہیں ہے۔ سختیاں اور شدائد و مصائب جنت کی راہ کے سنگ ہائے میل ہیں۔ ان سب چیزوں اور مرحلوں کا مقابلہ و مواجہہ (face) کرنے کا ایک پختہ ارادہ وجود میں آئے اور اس ارادے کو تقویت دینے والا ایک نظام موجود ہو تو جنت کی شاہراہ پر انسان کی پیش قدمی ممکن ہو سکے گی۔ ہمارا خانقاہی نظام درحقیقت اسی بنیاد پر قائم تھا اور اسی لیے اس کا نقطۂ آغاز تھا لفظ مرید' یعنی وہ شخص جس نے خیر کی راہ پر چلنے کا ارادہ کر لیا ہے اور خود کمرِ ہمت کس لی ہے' اب اس کو ایک ایسا نظام درکار ہے جو اس کے ارادے کو تقویت دینے کا باعث ہو۔

علم کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے!

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کے اندر یہ ارادہ پیدا کرنے اور اُسے تقویت دینے والی شے کیا ہے؟ یا جس کے متعلق میں نے کہا تھا کہ جذبات کو صحیح رُخ پر ڈالنے والی چیز کون سی ہے؟ اگرچہ تعمیر کردار کا اصل تعلق انسان کے جذبات کے ساتھ ہے' اصل ضرورت علم و فہم کی نہیں ہے' وہ اپنی جگہ اہم ہیں' ان کا اپنا ایک مقام ہے' لیکن یہاں جو موضوع زیر بحث ہے وہ ہے تعمیرِ کردار —— کردار کے اعتبار سے ہو سکتا ہے کہ ایک اَن پڑھ شخص کسی بڑے فلسفی سے بھی بہت بلند ہو۔ یہ نہ سمجھئے گا کہ میں علم کی اہمیت کی نفی کر رہا ہوں۔ وہ اپنی جگہ مسلم ہے' لیکن مسئلہ یہ

(۲) صحیح البخاری' عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ۔

ہے کہ جس موضوع پر ہم اس وقت گفتگو کر رہے ہیں اس کے اعتبار سے کس چیز کی زیادہ اہمیت ہے۔ مولانا رومؒ کا وہ شعر یاد کیجئے کہ ؎

علم را بر دل زنی یارے بود!
علم را بر تن زنی مارے بود!

وہی علم ہے کہ اگر انسان اس کو اپنے دل پر ڈالے' اس کا سایہ دل پر پڑے' اس کا انعکاس قلب پر ہو تو وہ علم انسان کا دوست ہے' اس کو سیدھی راہ بتانے والا ہے۔ اور وہی علم اگر تن و توش پر ڈال دیا جائے اور اس کو صرف انسان اپنی معاش کے حصول کا ذریعہ بنا لے یا دنیا کمانے کا ایک وسیلہ سمجھ بیٹھے تو وہ انسان کے حق میں سانپ ہے۔ علم کی نفی ہرگز مقصود نہیں ہے' اس کی اپنی جگہ بہت بڑی اہمیت ہے۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ (فاطر:۲۸) ''یقیناً اللہ سے ڈرتے تو اُس کے بندوں میں سے وہی ہیں جو اہلِ علم ہیں''۔ پھر علم کا جو مرتبہ اور مقام ہے اس کے لیے نبی اکرم ﷺ کا یہ فرمان بھی موجود ہے کہ ''رات بھر کی عبادت کے مقابلے میں ایک عالم دین کی گھڑی بھر کی تعلیم و تعلّم افضل ہے''۔ ہمارے دین میں نسبت و تناسب یہ ہے کہ ایک شخص پوری رات نوافل کی ادائیگی کے لیے کھڑا رہتا ہے' اس کے مقابلے میں ایک عالمِ دین دین کے درس و تدریس میں ایک گھنٹہ صَرف کرتا ہے تو اس دوسرے کام کو آنحضور ﷺ افضل قرار دے رہے ہیں۔ پس علم کا بلند مقام اپنی جگہ ہے۔ میں جو بات بیان کر رہا ہوں' وہ یہ ہے کہ اصل میں تعمیر کردار و سیرت کا تعلق جذبات سے ہے' فکر و فہم سے نہیں ہے۔ اس کا تعلق انسان کے ارادے سے ہے اور اس ارادے کو تقویت کی ضرورت ہے۔

انسانی جذبات کی دو نوعیتیں: جذبۂ محبت اور جذبۂ خوف

اس موضوع سے متعلق یہ بات بھی جان لیجیے کہ انسانی جذبات دو نوعیّتوں کے ہوتے ہیں' یا جذبہ محبت کا ہوتا ہے یا جذبہ خوف کا۔ یہ دونوں بنیادی جذبات ہیں کہ جن کے تحت انسان کی سیرت' اس کا کردار' اس کا اخلاق اور اس کا رویّہ بنتا اور بگڑتا ہے اور ان ہی دونوں جذبات کے تحت ایک انسان کی زندگی کے اعمال اور معاملات ایک مخصوص شکل اور نہج و طرز اختیار کرتے ہیں۔ پس انسان کے تمام جذبات محبت اور خوف پر مبنی ہوتے ہیں۔ ہم محبت کو مثبت اور خوف کو منفی جذبہ کہہ سکتے ہیں۔

اب ذرا جائزہ لیجیے کہ دنیا میں اس وقت جتنے بھی نظام ہائے فکر و عمل موجود ہیں' ان میں آپ دیکھیں گے کہ ان نظاموں میں انسانی تہذیب و تمدن اور سیاسیات و عمرانیات کی اجتماعی گاڑی چلانے کی اسکیم میں ملک کے رہنے والے لوگوں کی تعمیرِ کردار اور تعمیرِ سیرت و شخصیت کے لیے ان دونوں جذبات کو کسی نہ کسی اعتبار سے سمویا اور استعمال (apply) کیا گیا ہے۔ محبت کے اعتبار سے دیکھئے تو ان تمام نظام ہائے فکر و عمل میں اپنے وطن کی محبت' اپنی قوم کی محبت یا اپنی تاریخ کی کسی عظیم شخصیت کی محبت (hero worship)' یہ محبتیں آپ کو دنیا کے اکثر و بیشتر معاشرے کے لوگوں کی تعمیر کردار و سیرت میں نمایاں طور پر کارفرما نظر آئیں گی۔ اور امر واقعہ بھی یہی ہے کہ ان محبتوں کی بنیاد پر ایک کردار وجود میں آتا ہے اور ہم دنیا میں اس کا مشاہدہ سر کی آنکھ سے کر سکتے ہیں۔ اسے قوم پرستانہ سیرت کہیں' شخصیت پرستانہ کردار کہیں' لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں سے ہر ایک محبت کی بنا پر ایک کردار وجود میں آتا ہے۔ اگر انسان میں واقعی اپنے وطن' اپنی قوم اور اپنے مشاہیر (heroes) کی محبت ہے تو اس میں اپنی قوم کی سربلندی اور اپنے وطن کی عظمت کے لیے' اپنے وقار اور غیرت کے لیے ایثار و قربانی اور محنت و مشقت کا جذبہ پیدا ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان جذبات اور ایثار و قربانی کی بدولت اکثر قوموں نے دنیا میں بہت کچھ حاصل (achieve) کیا ہے اور وہ فائز المرام ہوئی ہیں۔ آخر اس وقت دنیا میں مسلمانوں کے علاوہ جو بے شمار قومیں ہیں وہ خدا پرست قومیں تو نہیں ہیں' ان کا آخرت پر تو کوئی یقین ہی نہیں ہے۔ ان کے یہاں اس وقت جو بھی نظام ہے وہ درحقیقت اسی نوع کی محبتوں کی بنیاد پر قائم ہے۔ یہی محبتیں ان قوموں کے جذبات کو متحرک (motivate) کرتی اور رکھتی ہیں۔ اس طرح بھی انسانوں میں ایک زوردار جذبۂ عمل اُبھرتا ہے' ایک مضبوط کردار وجود میں آتا ہے' جو اپنے معاشرے اور اپنے ملک کو مضبوط بنیادیں فراہم کرتا ہے۔

تعمیرِ سیرت و کردار میں حُبّ الوطنی و قوم پرستی کی اہمیت

ہمارا معاملہ اس وقت یہ ہے کہ ہمارا جو اصل نظامِ فکر ہے' جس کو عام طور پر ہم ''نظامِ عقائد'' سے تعبیر کرتے ہیں' اس میں وطن اور قوم کی عظمت اور شخصیت پرستی کی کوئی جگہ نہیں۔ زمین کے تقدس کا کوئی احساس ہمارے دلوں میں راسخ نہیں۔ زمین زمین ہے' رہنے کی جگہ ہے' اس میں ہماری معاش ہے' بس اس سے زائد تو کچھ نہیں۔ یہ کوئی دیوی نہیں' کوئی دیوتا نہیں۔ یہ کوئی ماتا نہیں —— ''دھرتی ماتا'' کا کوئی تصور ہمارے نظامِ فکر میں موجود

نہیں (۳)۔ وطن اور زمین کے لیے ہمارے یہاں جو تقدس کا لفظ بعض اوقات استعمال ہو جاتا ہے وہ بھی دوسروں کے دیکھا دیکھی زبان پر یا تحریر میں آ جاتا ہے اور بس۔ لیکن واقعتاً ہمارے احساسات جس فکر کے تابع ہیں اور ہمارا خمیر جس مٹی سے اُٹھا ہے' اس میں ایسی کوئی چیز موجود نہیں ہے اور نہ اس کی کوئی گنجائش ہے۔ ہمارا معاملہ کچھ ''اور'' ہے (۴) ـــــ لیکن بدقسمتی سے وہ ''اور'' تو موجود ہے نہیں۔ یہ بات بھی صحیح ہے کہ وطن کی تقدیس کا تصور بھی ہمارے ہاں موجود نہیں ہے' تو یوں سمجھئے گویا ہمارے پاؤں تلے زمین ہی نہیں ہے۔ وہ ''اور'' یہ ہے کہ اسلام جو برتر' بالاتر اور ارفع و اعلیٰ محبتیں ہمارے دلوں میں پیدا اور راسخ کرنا چاہتا ہے وہ اللہ کی محبت' اُس کے رسول ﷺ کی محبت اور اُس کی راہ میں جہاد کی محبت ہے۔ اس پر تفصیل سے میں آگے کچھ عرض کروں گا۔ بہرحال یہ محبتیں جن کی بنیاد پر دنیا کچھ نہ کچھ کھڑی ہے اور ان کے یہاں ایک قومی کردار موجود ہے' ان کی اپنی جگہ اہمیت ہے۔ چنانچہ وہ دوسروں کو دھوکہ دے لیں گے لیکن اپنی قوم کو دھوکہ نہیں دیتے' وہ دوسری قوموں کو فریب دے لیں گے' ان سے عہد شکنی کریں گے' ان پر جور و تعدی کر لیں گے' لیکن اپنی قوم کے ساتھ یہ معاملہ نہیں کرتے۔ یہ بڑی بنیادی بات ہے۔ دیکھئے نبی اکرم ﷺ نے دعوتِ اسلامی کے آغاز میں اسی بنیادی بات کو اپنے ایک خطبے میں بطور استدلال استعمال فرمایا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بالکل ابتدا ہی میں آنحضور ﷺ نے یہ خطبہ بنو ہاشم یا قبیلہ قریش کے سربرآوردہ افراد کے کسی اجتماع میں ارشاد فرمایا تھا۔ نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں:

---

(۳) اس کے برعکس قرآن حکیم کا ارشاد تو یہ ہے کہ: ﴿یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَةٌ فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾﴾ (العنکبوت) ''اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو' میری زمین وسیع ہے' پس تم میری ہی بندگی بجالاؤ۔'' یعنی تمہاری تخلیق کی اصل غایت عبادتِ ربّ ہے۔ اگر کسی مؤمن کو اپنے وطن میں عبادت کے تقاضے پورے کرنے میں مشکل پیش آ رہی ہو تو وہ اپنے وطن کو چھوڑ کر وہاں چلا جائے جہاں وہ اللہ کا بندہ بن کر رہ سکے۔ اسی آیت کے پیش نظر ہجرتِ حبشہ واقعہ ہوئی تھی۔ (مرتب)

(۴) اس بات کی علامہ اقبال مرحوم نے یوں تفسیر کی ہے:

اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ (مرتب)

((اِنَّ الرَّائِدَ لَا یَکْذِبُ اَھْلَهٗ، وَاللّٰہِ لَوْ کَذَبْتُ النَّاسَ جَمِیْعًا مَا کَذَبْتُکُمْ، وَلَوْ غَرَرْتُ النَّاسَ جَمِیْعًا مَا غَرَرْتُکُمْ، وَاللّٰہِ الَّذِیْ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اِنِّیْ لَرَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ خَاصَّةً وَّ اِلَی النَّاسِ کَافَّةً))

''(لوگو!) تم جانتے ہو کہ رائد (قافلے کا رہنما) اپنے قافلے والوں سے کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ اللہ کی قسم! اگر (بفرضِ محال) میں تمام انسانوں سے جھوٹ کہہ سکتا تب بھی تم سے کبھی جھوٹ نہ بولتا اور اگر (بفرضِ محال) میں تمام انسانوں کو دھوکہ اور فریب دے سکتا تب بھی تمہیں کبھی نہ دیتا۔ اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں! میں اللہ کا رسول ہوں، تمہاری طرف خصوصاً اور پوری نوعِ انسانی کی طرف عموماً!''

یہ اُس خطبے کی تمہید ہے۔ میرا جو کتابچہ ''دعوت الی اللہ'' کے نام سے دستیاب ہے، اس میں یہ پورا خطبہ موجود ہے۔ بڑا ہی عظیم خطبہ ہے، اگرچہ نہایت مختصر ہے، لیکن انتہائی جامع ہے۔ دعوتِ اسلامی کا خلاصہ، اس کا لُبِّ لُباب، اس کا جوہر اس میں موجود ہے۔ ساتھ ہی اس میں یہ بات بھی بتادی گئی ہے کہ کس شے کی اقدمیت ہے اور کون سی چیز مؤخر ہے۔ پھر اس میں خطابت اپنی معراج پر ہے۔ گو چند جملے ہیں۔ حضور ﷺ کا اپنا ارشاد ہے کہ ((اَنَا اَفْصَحُ الْعَرَبِ))۔ اس خطبے کا تمہیدی جملہ دیکھئے اس میں کتنی مؤثر اپیل ہے۔

فرمایا کہ تم تو میرے اپنے ہو (You are my khith and kin) میں تم کو کیسے دھوکہ دے سکتا ہوں؟ جس طرح قافلے کا راہنما اپنے قافلے والوں کو دھوکہ دے کر ہلاکت میں نہیں ڈال سکتا، اسی طرح میں تمہارے ساتھ دھوکہ اور فریب کا معاملہ کیسے کر سکتا ہوں؟ میں اگر (بالفرض) پوری دُنیا سے جھوٹ بول سکتا تو تم سے کبھی نہ بولتا اور (بالفرض) اگر میں پوری دنیا کو فریب دے سکتا تو تم کو کبھی نہ دیتا۔ چونکہ اُس وقت مکّہ والوں کی ذہنی سطح قوم پرستانہ ہی تھی، چنانچہ ''کَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰی قَدْرِ عُقُوْلِھِمْ'' کے پیشِ نظر نبی اکرم ﷺ نے ان کی اس ذہنی سطح اور افتادِ طبع کے مطابق اپنے اس خطبے کی تمہید باندھی۔

اگر قوم کی عظمت کا کوئی احساس ہو یا وطن کے تقدس کا کوئی لحاظ ہو، جیسے ''جے ہند'' کا نعرہ، تو یہ چیزیں اور نعرے دلوں کو گرماتے ہیں۔ اگر واقعی قوم اور وطن سے محبت ہے تو ان چیزوں اور نعروں سے انسان کے دل میں ایک جذبۂ عمل اُبھرے گا، اس کی خوابیدہ قوت بروئے کار آجائے گی۔ پھر وہ قوم و وطن کے لیے قربانیاں دے گا۔ بڑے سے بڑے کٹھن

مراحل سے گزر جائے گا۔ پس قوم اور وطن کی محبت وہ چیزیں ہیں جن کو دنیا کے بہت سے نظام ہائے فکر میں جذبات کو انگیخت کرنے اور تعمیرِ کردار کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔ ان محبتوں کی بنا پر ایک قومی کردار وجود میں آتا ہے جس سے یہ ضرور ہوتا ہے کہ انسان اپنی قوم اور اپنے اہلِ وطن سے نہ دھوکہ اور فریب سے کام لیتا ہے' نہ قوم اور وطن سے غداری کرتا ہے۔ تو اس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ قوم کی عزت اور وقار محفوظ رہتا ہے اور اُسے عالمی سطح پر ایک مقام میسر آتا ہے۔

تعمیرِ سیرت و کردار میں 'نظریہ حُبِّ انسانی' بلند تر ہے!

اسی محبت کے جذبے کو پیدا کرنے کے ضمن میں زمانہ حال میں ایک اور مظہر ہمارے سامنے آیا ہے اور وہ ہے کسی نظریہ کی محبت' اور اس نظریے کا بول بالا کرنے کی محبت اور جذبہ —— اس فکر کا جب تجزیہ کیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ اس کی تہہ میں درحقیقت انسان کی محبت کارفرما نظر آئے گی۔ گویا وطن سے محبت' قوم سے محبت' کسی قومی شخصیت سے محبت' ان تین محبتوں سے ایک بالاتر محبت بھی ہے اور وہ ہے انسان دوستی اور انسان سے محبت —— فلسفہ میں آج کل اس کا بڑا چرچا ہے' اس پر بہت زور ہے اور اس کا بہت پرچار کیا جا رہا ہے۔ اسے فلسفے میں Humanism یعنی انسان دوستی یا حبِ انسان سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اگر آپ غور کریں تو آپ تسلیم کریں گے کہ یہ محبت آفاقی بھی ہے اور انسان کی خیر کے لیے یہ بھی ایک بہت بڑا جذبہ' محرکہ (motivating force) بن سکتی ہے۔ اس کا یہ عملی مظہر ضرور سامنے آیا ہے کہ جب کوئی ایسی idealogy اور کوئی ایسا نظریہ انسان کے سامنے آتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس نظریے کو اختیار کرنے میں انسانیت کی خیر اور بھلائی ہے' اس سے ظلم ختم ہو جائے گا' استحصال کی بیخ کنی ہو جائے گی' اس نظریے کے بروئے کار آنے سے عدل و قسط اور منصفانہ نظامِ اجتماعی قائم ہو سکے گا جس کی بدولت انسان کو امن و سکون اور چین میسر آئے گا' مثلاً یہ کہ ایک ایسی سوسائٹی وجود میں آجائے گی جس میں طبقاتی امتیاز اور فرق و تفاوت ختم ہو جائے گا' سب انسان برابر ہو جائیں گے' حقیقی مساوات قائم ہو جائے گی تو انسان دوستی کے جذبے کے پیش نظر یہ نظریہ انسان کے تصورات اور تخیلات (imaginations) کو قابو (catch) کرتا اور انسانوں کے اذہان و قلوب کو مطمئن اور قائل (convince) کرتا ہے۔ پھر جو لوگ اس نظریے کو دل و جان سے قبول کرتے ہیں وہ اس کے پرچار اور اس کے مطابق ایک نظام بالفعل قائم کرنے کے لیے محنت و مشقت کرتے ہیں۔ اپنا تن' من اور دھن اس کے لیے نچھاور کرتے

ہیں' قربانیاں دیتے ہیں' ایثار کرتے ہیں' پھانسیوں کے پھندوں کو چوم کر اپنی گردنوں میں ڈالتے ہیں' اپنے گریبان کھول کر اور سینہ تان فائرنگ سکواڈز کا مواجہہ کرتے ہیں' تو اس تمام عمل کی تہہ میں دراصل حُبِ انسانیت (Humanism) کا جذبہ ہی کارفرما ہوتا ہے جو ان کو اتنی عظیم قربانیاں دینے پر آمادہ کرتا ہے۔

گزشتہ جنگ عظیم کے موقع پر جرمن اور جاپانی قوم کا جو جذبہ تھا وہ تو یقیناً ان کی قوم پرستی کی بنیاد پر تھا۔ وہ کسی نظریے (ideology) کے غلبے اور تسلّط کے لیے نہیں بلکہ ملک گیری اور اپنے ملک وقوم کے استیلاء اور اپنی حکومت کی وسعت کے تحت تھا۔ لیکن ان کے مقابلے میں وہ ملک بھی تھا جس کے پاس ایک انقلابی نظریہ ہے اور وہ ممالک بھی تھے جن کا نعرہ (catch word) جمہوریت ہے۔ آپ حضرات سمجھ گئے ہوں گے کہ میں کس کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔ کمیونزم انقلاب کی کامیابی سے قبل اس نظریے کے پرچار اور اس نظریے پر مبنی ایک نظام مملکت قائم کرنے کی جدوجہد میں کامریڈ مَردوں اور کامریڈ عورتوں نے جو قربانیاں دی ہیں' ایثار کی جو نظیریں قائم کی ہیں اور جابر و مستبد شخصی حکمرانوں کے تشدد و مظالم اور جور و ستم کو جس طرح برداشت کیا ہے' دل پر ہاتھ رکھ کر بتایئے کہ اس کی تہہ میں کون سا قوم پرستانہ جذبہ تھا؟ یہ دراصل ایک 'نظریہ' کی محبت کا جذبہ تھا جسے ایک اعتبار سے وطن وقوم اور شخصیت پرستی سے بالاتر محبت یعنی حُبِ انسانیت (Humanism) سے تعبیر کیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ آخر انسان میں اللہ تعالیٰ نے ترفّع اور بلندی بھی رکھی ہے: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝۴﴾ (التین)۔ اس میں اپنی ذات' اپنی قوم اور اپنے ملک ووطن کی خیر خواہی' عظمت اور وقار سے بلند ہو کر پوری انسانیت کے خیر وصلاح کے لیے سوچنے اور اس کے لیے عملی جِدّوجُہد کرنے کی صلاحیت بھی ودیعت کی گئی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اُس ذاتِ گرامی کے جمال وجلال اور کمال سے محجوب اور اس کی نازل کردہ ہدایت سے محروم ہو کر اپنے فکر وفہم سے حبِ انسانیت اور انسان دوستی کے نظریات وضع کرتا اور ان کو اختیار کرتا ہے تو اس طرح افراط وتفریط کے گورکھ دھندے میں اُلجھ کر اور ایک طلسم خیال وتخیل میں گرفتار ہو کر رہ جاتا ہے۔ بہرحال انسان دوستی اور اشتراکیت کے فلسفے میں قوم ووطن پرستی کے مقابلے میں ایک ترفّع ہے' خواہ وہ ہمیں نظر نہ آئے یا ہمارے ادراک کی اس تک رسائی نہ ہو۔

تو یہ ہے ایک ایسی محبت جو بسا اوقات انسان سے بڑے عظیم کارہائے نمایاں سرانجام دلا

دیتی ہے اور وہ کام کرا لیتی ہے جو بادیٔ النظر میں اَن ہونے معلوم ہوتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ انسان کے اندر سے قوت و برداشت کا لاوا اُبلتا ہے۔ یہ محبت خود غرضی کو ختم کر کے رکھ دیتی ہے۔ انسان ایک مقصد' ایک آئیڈیل' ایک آدرش' ایک نصب العین کے لیے تَن مَن دھن سب کچھ قربان کر دیتا ہے۔ یہ سب کچھ بنیادی طور پر اسی محبت کا غیر معمولی مظہر ہوتا ہے جو کسی خیال یا نظریہ یا شخصیت کی محبت اس طرح گھر کر لیتی ہے کہ جس کے نتیجے میں ایسے کردار اور ایسی سیرت کی تعمیر ہوتی ہے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ سیرت و کردار نام ہی مضبوط قوتِ ارادی کا ہے۔ تو کیا آپ کے خیال میں اس مضبوط قوتِ ارادی اور عزیمت کے بغیر دنیا میں کوئی انقلابی تحریک چل سکتی ہے؟ ایک نظام کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر ایک دوسرا نظام قائم کرنا ہے' انقلاب برپا کرنا ہے' تو جو لوگ اس کا داعیہ لے کر سامنے آئیں گے' جو اس کا بیڑا اٹھائیں گے ان کے اندر تو بڑی زبردست قوتِ ارادی کی ضرورت ہے' اور یہ قوتِ ارادی پیدا ہوتی ہے اس انقلابی نظریے' اس انقلابی خیال اور اس انقلابی نظام کی محبت سے۔ اور جب اس کا مزید تجزیہ کیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ اس کی تہہ میں دراصل انسان کی محبت' انسان کی فلاح' انسان کے ایک بہتر مستقبل کی خواہش مستور نظر آئے گی۔

اسلام میں تعمیرِ سیرت و کردار کی اوّلین بنیاد: محبّتِ الٰہی

اب دیکھئے کہ اس مقصد کے لیے اسلام کون سی بنیاد دیتا ہے۔ تعمیرِ سیرت و کردار کے لیے اسلام نے جو بنیاد دی ہے وہ یہی محبت کی بنیاد ہے۔ اسلام اولین اور اقدم ترین محبت' اللہ کی محبت کو قرار دیتا ہے۔ میں نے آج آغاز میں جن آیات کی تلاوت کی ہے ان میں سب سے پہلے میں نے سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۶۵ کا درمیانی حصہ پڑھا ہے۔ اس سے قبل کے الفاظِ مبارکہ بھی ملاحظہ کیجیے۔ فرمایا:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ﴾

''اور لوگوں میں ایسے بھی لوگ ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا ہمسر اور مدِمقابل بناتے ہیں اور ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی اللہ کے ساتھ ہونی چاہیے۔ حالانکہ ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں۔''

قرآن حکیم کا اعجاز و ایجاز دیکھئے کہ نہایت اختصار لیکن انتہائی جامعیت کے ساتھ اس

سارے فلسفے پر تبصرہ کر دیا۔ انسان میں محبت کا یہ جذبہ درحقیقت اللہ کی محبت کے لیے رکھا گیا تھا۔ اگر یہ جذبۂ محبت کسی اور چیز سے منسلک اور وابستہ (attach) ہو گیا ہے' دل کی سنگھاسن پر اللہ کی محبت کے بجائے کوئی اور محبت براجمان ہو گئی ہے تو یہ بے راہ رَوی (perversion) ہے۔ وہ جذبہ محبت غلط رُخ پر پڑ گیا ہے۔ ازروئے قرآن حکیم انسان کی محبت کا اصل مرکز درحقیقت ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ بھوک انسان کی جبلت میں ہے اور ہر شخص کوشش کرتا ہے کہ بھوک مٹانے کے لیے اچھی سے اچھی' صالح' مفید' طیب غذا حاصل کرے۔ لیکن یہ داعیہ اتنا شدید ہے کہ اگر انسان کو کسی وقت اچھی غذا نہیں ملتی تو اس مجبوری کی حالت میں یہ داعیہ انسان کو بُری غذا پر منہ مارنے پر آمادہ کر دیتا ہے۔ چنانچہ فطرتِ انسانی کی اسی کمزوری کے پیش نظر ﴿خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا ﴿۲۸﴾﴾ (النساء) قرآن مجید میں چھوٹ اور رعایت دی گئی ہے کہ اضطرار اور انتہائی مجبوری کی حالت میں حرام چیز کھائی جا سکتی ہے۔ یہ استثناء سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۳ اور سورۃ المائدۃ کی آیت ۳ میں بیان ہوا ہے۔ ایک شخص اضطرار کی حالت میں آ گیا ہے' کچھ اور کھانے کو نہیں ہے تو وہ جان بچانے کی خاطر حرام غذا میں بھی منہ مار سکتا ہے' اس کی اجازت ہے۔ اسی طرح فاطر فطرت نے انسان کے اندر محبت کا یہ جذبہ رکھا تو اس لیے تھا کہ مجھ سے محبت کرو!

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾﴾ (الذّٰریٰت)

''میں نے جِنّوں اور انسانوں کو پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔''

اور بندگی کے متعلق میں کئی بار عرض کر چکا ہوں کہ اس کا جسدِ ظاہری اطاعت اور روح باطنی محبت ہے۔ عبادت اصل میں کہتے ہی اس کو ہیں جو کسی ہستی کی محبت سے سرشار ہو کر کی جا رہی ہو۔ کسی ہستی کی عظمت کے جذبے اور احساس سے انسان ایک عجز اور تذلّل کی کیفیت اپنے اندر پائے اور اس کے سامنے جھک جائے۔ امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے عبادت کی تعریف یوں کی ہے: ''العبادۃُ تجمع اصلین :غایۃ الحب مع غایۃ الذُّلِّ وَالخُضوع'' یعنی عبادت میں دو بنیادی چیزیں لازماً شامل ہوں گی۔ ایک انتہائی درجے کی محبت یعنی انتہائی شوق و رغبت' وارفتگی اور دل کی آمادگی اور انبساط و نشاط کے ساتھ اپنے معبود سے محبت اور اس کے ساتھ ساتھ نہایت درجے کی عاجزی اور فروتنی۔ لیکن انسان نے جس طرح عبودیت میں شریک ٹھہرا لیے

اسی طرح وہ شرک فی المحبت میں مبتلا ہو گیا اور طیب و محمود محبت کو چھوڑ کر نجس و ناپاک راہ پر گامزن ہو گیا۔

اسی بنا پر علامہ اقبال مرحوم نے وطن کو اس دور کا سب سے بڑا بُت کہا ہے۔ جب وطنیت کے نظریے کو محبت کا اصل مرکز بنا دیا گیا تو درحقیقت وطن کو وہاں بٹھایا گیا جہاں اللہ کو ہونا چاہئے تھا۔ چنانچہ علامہ مرحوم نے کیا خوب کہا ہے:

اِس دور میں مے اور ہے، جام اور ہے، جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

غیر اللہ کو محبت کے سنگھاسن پر بٹھانے اور لوگوں کی ذہنی پستی پر قرآن حکیم نے کتنا معجزانہ اور مختصر مگر جامع تبصرہ صرف چند الفاظِ مبارکہ میں فرمایا ہے: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ﴾ گویا انہیں طیّب اور حلال غذا میسر نہیں آئی، اس لیے یہ غلیظ، نجس اور گندی غذا پر منہ مار رہے ہیں۔ طیّب و پاکیزہ چیز کیا ہے؟ وہ ہے اللہ تعالیٰ کی شدید ترین محبت ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ﴾ ایمان کا اصل تقاضا کیا ہے؟ ایمان کا اصل مظہر کیا ہے؟ اگر دل میں ایمانِ حقیقی موجود ہو تو اس کا ظہور کس شکل میں ہوگا؟ وہ شکل ہے: ﴿اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ﴾ —— تمام چیزوں کی محبت کے مقابلے میں شدید ترین محبت جب تک اللہ کی نہیں ہو جائے گی تو جان لیجیے ایمانِ حقیقی موجود نہیں ہے۔ اس موضوع پر، ان شاء اللہ، قدرے تفصیل سے گفتگو ہوگی۔

ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت: ایمان باللہ کی فروع

ہمارے مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب میں ایمان کے مباحث کے ضمن میں تفصیل سے عرض کیا کرتا ہوں کہ ''ایمان'' اصل میں نام ہے ایمان باللہ کا۔ ایمان بالرسالت اور ایمان بالمعاد یا ایمان بالآخرۃ دراصل اسی ''ایمان باللہ'' کی فروع (corollaries) ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفتِ ہدایت کا تکمیلی مظہر ہے: نبوت و رسالت —— اور اللہ کی صفتِ عدل کا تکمیلی مظہر

ہے: بعث بعد الموت اور آخرت۔ یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی دو صفاتِ کمال کے دو مظہر ہیں۔ پس اصل ایمان کیا ہوا: ایمان باللہ۔ باقی ایمانیات اس کی شرح و تفصیل ہیں۔ ع ''یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں!'' یہ بات پوری طرح ہمارے ذہن نشین ہو سکتی ہے اگر ہم ''ایمانِ مجمل'' اور ''ایمانِ مفصل'' کو سامنے رکھیں۔ ایمان مجمل میں صرف اللہ کا ذکر ہے: ''آمَنْتُ بِاللّٰهِ كَمَا هُوَ بِاَسْمَآئِهٖ وَصِفَاتِهٖ وَقَبِلْتُ جَمِيْعَ اَحْكَامِهٖ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَتَصْدِيْقٌ بِالْقَلْبِ'' مجمل ایمان پورا ہو گیا۔ ہاں جب اس ایمان کی تشریح و تفصیل درکار ہو تو ''ایمان مفصّل'' یہ ہو گا: ''آمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ'' —— بالکل اسی طرح سمجھئے کہ اصلاً جو محبت' سیرت و کردار کا بنیادی پتھر (corner stone) ہے' وہ ہے محبتِ الٰہی —— لیکن اسی محبت کے ساتھ کچھ اور محبتیں بھی جڑی ہوئی (bracketed) ہیں' جو اسی محبتِ خداوندی کی شرح و تفصیل ہیں۔ ان محبتوں میں نمبر ایک پر آئے گی محبتِ رسول ﷺ (۵)۔ میں نے یہاں پر جان بوجھ کر ''عشقِ رسول ﷺ'' استعمال نہیں کیا۔ اس لیے کہ یہ لفظ نہ قرآن کا ہے نہ حدیث کا۔ عربی زبان میں ''عشق'' ایک بڑی منفی کیفیت کا نام ہے۔ قرآن و حدیث میں عربی کے جو الفاظ منتخب (choose) کیے گئے ہیں' ان میں بڑی بڑی حکمتیں ہیں۔ قرآن و حدیث کے الفاظ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ افصح العرب کے منتخب کردہ ہیں۔ یہ ان کا انتخاب ہے کہ کون سا لفظ لینا ہے اور کون سا نہیں لینا۔ چنانچہ لفظ ''حب' (محبت) لیا ہے' عشق نہیں لیا۔ لفظ عشق میں کسی کی شیفتگی میں سوکھنے کا مفہوم شامل ہے' جبکہ لفظ محبت میں جوشِ عمل و اقدام اور پروانہ وار شوقِ جان نثاری و قربانی کے مفاہیم شامل ہیں۔ لہٰذا محبت جوش و خروش اور جان نثاری کا ایک مظہر ہے جبکہ عشق کسی کی محبت میں سوکھنے' دِل گرفتہ ہونے اور عمل سے تہی دست ہونے کا مظہر ہے۔ تو انسانی کردار کو بے عمل بنانا مقصود نہیں ہے' بلکہ اس کو فعال بنانا مطلوب ہے۔ البتہ فارسی فلسفۂ محبت کا جو ذہنی پس منظر تھا' اس میں عشق ہی کی کیفیات مطلوب و مقصود تھیں۔ لہٰذا ان کی شاعری اور انشا پردازی میں لفظ عشق نے جگہ پائی اور وہیں سے یہ لفظ اردو ادب میں بھی آ گیا اور ہمارے یہاں ''عشقِ رسول ﷺ'' کی

---

(۵) حدیث رسول ﷺ: ((لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ))(صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب حب الرسول من الایمان) (مرتب)

اصطلاح رواج پا گئی۔(۶)

تعمیرِ کردار اور سیرت سازی کے لیے از روئے قرآن جو مضبوط اور قابلِ اعتماد سہارا ہے' وہ دراصل محبت الٰہی ہے۔ یہی العروۃُ الوثقٰی ہے۔ یاد کیجیے کہ آیت الکرسی کے فوراً بعد والی آیت کے آخری ٹکڑے میں فرمایا گیا: ﴿فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ﴾(البقرۃ:۲۵۶) ''جو طاغوت کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے۔'' اللہ کے سوا جو دوسری محبتیں ہیں ان سب کو مسترد کر دے اور جس کی محبت ایمان لانے کی بدولت ذاتِ باری تعالیٰ پر مرتکز ہو جائے۔ ''پس اُس نے تو اس اصل اور مضبوط سہارے کو تھام لیا''۔ وہ مضبوط کڑا اب اس کے ہاتھ میں آ گیا ہے ''جس کے ٹوٹنے کا کبھی کوئی امکان نہیں'' یہ سہارا چھوٹے گا نہیں۔ یہ اعتماد انسان کو کبھی دھوکہ نہیں دے گا۔ انسان اس کے ساتھ جڑ گیا ہے تو وہ گویا خود اپنی ذات میں ایک چٹان (rock) بن گیا۔ اس چٹان کی بنیاد (rock foundation) ہے حُبِّ الٰہی' محبتِ خداوندی —— البتہ جیسے کہ میں نے عرض کیا' اسی کے ساتھ آ جائے گی محبتِ رسول ﷺ۔

تعمیرِ سیرت و کردار کی بنیادِ ثانی: حُبِّ رسول ﷺ

اس ضمن میں ایک اور بات بھی غور طلب ہے۔ وہ یہ کہ بعض اعتبارات سے لوگوں کی ذہنی سطحوں میں فرق و تفاوت ہے۔ اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جن کی ذہنی سطح بلند نہیں ہوتی اور ان کے لیے کچھ اور درکار ہوتا ہے۔ جیسے علامہ اقبال مرحوم نے کہا ؎

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر!

تو اس اعتبار سے لوگوں کے فہم و عقل میں فرق و تفاوت ہے' سب کی شعوری سطح (level of consciousness) یکساں نہیں ہے۔ لہٰذا جن لوگوں میں یہ کیفیت زیادہ ہو کہ ع ''خوگرِ پیکر محسوس تھی انسان کی نظر'' —— ان کے اعتبار سے محبتِ رسول ﷺ تعمیرِ سیرت و کردار میں زیادہ مؤثر ہو جاتی ہے بہ نسبت محبتِ الٰہی کے —— اس لیے کہ وہ ان کی ذہنی سطح سے قریب تر

(۶) اسی طرح لفظ ''مذہب'' قرآن و حدیث میں استعمال نہیں ہوا بلکہ ''دین'' استعمال ہوا ہے جس میں جامعیت اور ہمہ گیری ہے۔ لفظ مذہب میں محدودیت ہے اور یہ لفظ انسان کے محض شخصی معاملات سے بحث کرتا ہے۔ (مرتب)

ہے۔اس طرح ایک انسان کی شخصیت کا ہیولا اور ایک انسانی کردار ان کے سامنے آتا ہے' جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ اگر کسی نے کوئی تصور وابستہ کیا تو وہ شرک کے دائرے میں داخل ہو گیا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا کوئی بھی تصور اگر حاشیہ خیال میں آ گیا تو توحید کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ظاہر بات ہے کہ تصور تو ایک ذہنی تخلیق ہے۔ یہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا تخیل نہیں بلکہ کوئی اور معبود ہے' جس کو انسانی ذہن نے تراشا ہے۔ بقول شاعر ؎

می تراشد فکر ما ہر دم خداوندے دگر　　رُست از یک بند تا افتاد در بندے دگر

ذاتِ باری تعالیٰ کا ادراک تو وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے۔تصور و تخیل سے لات ومنات تراشے جا سکتے ہیں' اللہ جل سبحانہٗ کا تخیل وتصور ناممکنات میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ادراک سے عاجز ہو جانا ہی دراصل ادراک ہے۔ جیسا کہ فرمایا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے: اَلْعِجْزُ عَنْ دَرَكِ الذَّاتِ اِدْرَاكٌ اور اس پر گرہ لگائی حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے: وَالْبَحْثُ عَنْ كُنْهِ الذَّاتِ اِشْرَاكٌ —— چونکہ وہاں تک رسائی ممکن نہیں لہٰذا بعض لوگوں بلکہ اکثریت کے لیے واقعہ یہ ہے کہ تعمیرِ سیرت کے اعتبار سے محبتِ رسول ﷺ میں تاثیر زیادہ ہے۔ البتہ یہ بات ہر آن مستحضر اور یہ احتیاط ہر لحظہ ملحوظ رکھنے کی ہے کہ اصل محبت' محبتِ الٰہی ہے۔رسول ﷺ کی محبت اس محبت کے تابع اور اس سے وابستہ (bracketed) ہے۔

تعمیرِ سیرت وکردار کی بنیادِ ثالث: حُبِّ جہاد

ایک مسلمان کی تعمیرِ کردار کے لیے قوم' وطن اور شخصیتوں کی محبتوں کی جگہ اسلام نے اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی محبت پیش کی ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ سیرت سازی کے لیے ایک اور مؤثر عامل (factor) ہے کسی نظریے اور آئیڈیالوجی کی محبت' یعنی انسان کی محبت اور اس محبت سے سرشار ہو کر دنیا میں ایک عادلانہ ومنصفانہ نظام قائم کرنے کی جدوجہد۔ اسلام نے اس کا بھی بھرپور نعم البدل پیش کیا اور اس کا نام رکھا ''جہاد فی سبیل اللہ'' کی محبت۔ اُس مبنی برقسط اور عادلانہ نظام (اسلام) کو قائم کرنے کا جوش و ولولہ اور محبت' جو اللہ کا عطا کردہ دین الحق (نظامِ حیات) ہے: ﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۗ﴾ (آل عمران:۱۹) ''دین تو اللہ کے نزدیک بس اسلام ہی ہے''۔اسلام صرف ہمارے مذہبی تصورات اور اعتقادات پر مشتمل نہیں ہے بلکہ یہ ایک مکمل ضابطۂ زندگی اور نظامِ حیات ہے' جو اجتماعی طور پر پوری نوعِ انسانی کے لیے قسط اور عدل وانصاف کا پورا اہتمام کرتا ہے۔ قرآن حکیم انبیاء ورسل علیہم السلام کی

بعثت کا مقصد اسی عدل وقسط کے نظام کو قائم کرنا بھی قرار دیتا ہے' جیسے سورۃ الحدید میں فرمایا گیا:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ (آیت ۲۵)

''یقیناً ہم نے اپنے رسولوں کو بھیجا روشن نشانیوں (معجزات) کے ساتھ اور ہم نے اُتاری ان کے ساتھ کتاب (دستورِ حیات) اور میزان (نظام وضوابط حیات) تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔''

رسولوں کی بعثت اور انزالِ کتب ومیزان اللہ تعالیٰ کا کوئی کھیل اور مشغلہ (hobby) تو نہیں تھا۔ معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ! اُس نے اپنی کتابیں (تورات' زبور' انجیل اور قرآن) اس لیے تو نازل نہیں فرمائی تھیں کہ ان کو محض متبرک اشلوک سمجھ کر پڑھا جائے اور مقدس کتاب سمجھ کر عمدہ سے عمدہ کپڑوں کے غلافوں میں لپیٹ کر طاقوں میں رکھ دیا جائے۔ اور ''میزان'' یعنی دین الحق' شریعت' مکمل نظامِ حیات اس لیے تو نہیں اُتارا تھا کہ ہم اس کی مدح سرائی کر لیا کریں' اس کی شان میں قصیدے پڑھ لیا کریں۔ اس کی غایت تو یہ ہے کہ: لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ کہ لوگوں کو عدل وانصاف پر کاربند رکھنے کے لیے اس میزان کو نصب کیا جائے اور دین (نظامِ حیات) کو قائم کیا جائے۔ اب عدل وانصاف اور قسط کے اس نظام اور میزان کو قائم اور نصب کرنے کے لیے محنت اور جدوجہد درکار ہے' جو انبیاء ورسل کا منصب ہے۔ ان کو اور ان کے اصحاب وحواریین کو رائج شدہ ظالمانہ نظام میں جن لوگوں نے اپنے جائز حق سے زیادہ پر قبضہ کیا ہوا تھا ان سے اس دین اور میزان کے قیام ونصب کے لیے ٹکرانا پڑا۔ ان سے نبرد آزما ہونے اور ان کی سرکوبی کرنے کے لیے اللہ نے لوہا اُتارا ہے۔ چنانچہ سورۃ الحدید کی اسی آیت میں آگے فرمایا گیا: ﴿وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ ''اور ہم نے لوہا بھی اُتارا ہے جس میں جنگ کی شدید ترین صلاحیت ہے اور لوگوں کے لیے (تمدنی ضروریات میں) دوسرے فائدے بھی ہیں''۔ یعنی اسی لوہے سے شمشیر وسناں اور اسلحۂ جنگ تیار ہوتا ہے تو لوگوں کی تمدنی ضروریات اور فائدے کے لیے اسی لوہے سے دوسری بہت سی چیزیں بھی تیار ہوتی ہیں۔ لیکن یہ چیزیں لوہے کے by-products ہیں۔ لوہے کی اصلی قوت جو ہے وہ اسلحۂ جنگ ہے۔ اس ارسالِ رسل' انزالِ کتب ومیزان اور انزالِ حدید کی غرض وغایت اسی آیت کے آخر میں بایں الفاظ بیان کی گئی: ﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَ رُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ؕ اِنَّ

اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ ﴿۲۵﴾ یہ اس لیے کیا گیا ہے کہ اللہ دیکھ لے کہ کون ہیں اس کے وہ وفادار بندے جو اللہ سے غیب میں رہتے ہوئے اس لوہے کی طاقت کو ہاتھ میں لے کر اللہ اور اس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں' یعنی ان کے لائے ہوئے دین اور میزان کو قائم اور نصب کرتے ہیں۔

ہمارے دین نے تعمیر کردار اور سیرت سازی کے لیے اللہ' اُس کے رسول ﷺ اور جہاد کی یہ انتہائی قوی اور متحرک (dynamic) محبت عطا فرمائی ہے۔ اس لفظ dynamic پر ذرا غور کیجیے گا کہ اس سے کن تصورات اور کیفیات کی نفی ہوتی ہے۔ میں نے اسی لیے عرض کیا تھا کہ لفظ ''عشق'' جس میں فراق و ہجر میں سوکھنے اور فنافی الشیخ یا فنافی اللہ کے مفاہیم و تصورات شامل ہیں' قرآن و حدیث میں کہیں استعمال نہیں کیا گیا۔ اس کی جگہ محبت اور بقا باللہ کا تصور پیش کیا گیا ہے۔ اس حقیقت کو علامہ اقبال مرحوم نے دو اشعار میں بڑی خوبصورتی سے ادا کیا ہے ؎

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل　　یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات!

وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست　　یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات!

ایک تصوف وہ ہے جو جمود اور بے عملی پیدا کرتا ہے' جو معاشرے سے کنارہ کشی کا سبق دیتا ہے۔ جبکہ ایک تصوف وہ ہے جو انسان کو میدانِ عمل میں لاتا ہے' جُہد و کوشش کا درس دیتا ہے' تصادم و قتال کی دعوت دیتا ہے۔ نیکی کا ایک تصور وہ ہے جو راہب خانوں اور بدھ مت کے منڈلوں میں نظر آئے گا اور نیکی کا ایک تصور وہ ہے جس کے مطابق نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی تربیت بایں طور کی کہ: هُمْ رُهْبَانٌ بِاللَّيْلِ وَفُرْسَانٌ بِالنَّهَارِ ''وہ رات کے راہب اور دن کے شہسوار تھے''۔ ان کی شان یہ تھی کہ ﴿وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ﴾ جناب محمد رسول اللہ ﷺ کا تصوف تو یہ ہے۔ اس تصوف کا نقشہ کل ڈیڑھ سو سال قبل ہماری سرزمین نے بھرپور دیکھا ہے۔ یہ کوئی ہزار ڈیڑھ ہزار سال پہلے کی بات نہیں۔ دعائیں دیجیے ان مردانِ خود آگاہ اور خدا مست کو جنہوں نے یہ نقشہ آج سے ڈیڑھ سو سال قبل اسی برصغیر میں دکھا دیا تھا۔ مراد ہیں سید احمد شہید' شاہ اسمٰعیل شہید اور ان کے ساتھی مجاہدین۔ رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین۔ انہوں نے سلوکِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا نقشہ پھر ایک بار دنیا کو دکھا دیا تھا۔ اَللّٰهُمَّ نَوِّرْ قُبُوْرَهُمْ وَمَرَاقَدَهُمْ وَاَدْخِلْهُمْ فِي الْجَنَّةِ الْفِرْدَوْسِ۔

یہ ہے محبت کا وہ دوسرا درجہ جو اسلام نے دیا ہے اور جو انسان میں جوشِ عمل کی بجلیاں پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے۔ یہ انقلابی جذبہ ہے' متحرک اور dynamic جذبہ ہے' اور یہ ہے

جہاد فی سبیل اللہ کی محبت ۔اب دیکھئے کہ سورۃ التوبہ کی آیت ۲۴ میں‘ ان تینوں محبتوں کو کس خوبصورتی سے جمع کیا گیا ہے: (۱) اللہ تعالیٰ کی محبت (۲) اس کے رسول ﷺ کی محبت اور (۳) جہاد فی سبیل اللہ کی محبت —— اور انہیں ’’مال و دولت دنیا اور رشتہ و پیوند‘‘ پر کس طرح فوقیت دی گئی ہے۔ فرمایا:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۴﴾﴾

’’(اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دیجیے کہ اگر تمہارے باپ‘ تمہارے بیٹے‘ تمہارے بھائی‘ تمہاری بیویاں (اور بیویوں کے لیے شوہر)‘ تمہارے رشتہ دار اور وہ مال جو تم نے بہت محنت سے کمائے ہیں‘ اور وہ تجارت جس کے مندے کا تمہیں خطرہ رہتا ہے‘ اور وہ مکانات جو تمہیں بہت پسند ہیں‘ (اگر یہ سب چیزیں) تمہیں محبوب تر ہیں اللہ‘ اس کے رسول اور اس کے راستے میں جہاد سے‘ تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ سنا دے۔ اور اللہ ایسے فاسقوں کو راہ یاب نہیں کرتا۔‘‘

اس آیت مبارکہ میں نبی اکرم ﷺ کو دعوت دی گئی ہے کہ آپؐ اہلِ ایمان سے کہیں کہ وہ اپنی محبتوں کا جائزہ لے لیں۔ اس لیے کہ زندگی کا سارا کھیل تو محبت ہی کا ہے‘ جس میں علائقِ دنیا اور مال و زر کی محبت بڑی قوی محبت ہے۔

منفی اور ہوائے نفس کی محبتوں سے پرہیز

انسانیت مال و دولتِ دنیا کی محبت کی خاطر ٹھوکریں کھاتی نظر آ رہی ہے‘ انسان باطل کے آگے سرنگوں ہے۔ اس محبت میں اپنے شرفِ آدمیت‘ اپنے وقار‘ اپنی خودی اور اپنی عزت کا سودا کرنے والے لوگ دنیا میں ہر سو نظر آ رہے ہیں۔ اپنے ضمیر کو کچلنے اور اس کا گلا گھونٹ دینے والے لوگ چہار سو پھیلے ہوئے ہیں۔ مال و زر‘ شہرت و وجاہت اور شہوات کی محبتیں انسان کی ہوائے نفس سے متعلق ہیں‘ جو انتہائی گھٹیا اور پست و ادنیٰ محبتیں ہیں۔ وطن و قوم کی محبت ان نفسانی محبتوں سے یقیناً بلند و برتر محبت ہے‘ اس کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ جیسے کہ میں نے کئی مرتبہ عرض کیا ہے کہ فرقِ مراتب ضروری ہے ع ’’نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد‘‘۔ نہ اہلِ ایمان

سب برابر کے تھے اور نہ اہلِ کفر سب برابر کے تھے۔ اہلِ کفر میں ابوطالب بھی تھے اور ابولہب بھی تھا۔ کفر مشترک ہے مگر سیرت و کردار کا فرق صاف نمایاں ہے۔ اہلِ ایمان میں ابوبکر صدیق، عمر فاروق، عثمانِ ذوالنورین، علی حیدر اور دیگر اصحابِ عشرہ مبشرہ بھی تھے، اصحابِ بدر بھی، اصحابِ بیعت رضوان بھی تھے اور عام صحابہ کرام بھی تھے۔ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ع ''گر حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی!''

تو محبتوں کے معاملے میں ع ''پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے!'' کے مصداق اگر انتہائی پستی والی محبت دیکھنی ہو تو وہ ہے: ''محبتِ ذات'' —— اپنے ہی حریم ذات کا طواف اور اپنے ہی حریمِ ناز پر پروانہ وار نثاری —— اپنی دولت، اپنا مال و زر، اپنی شہرت و وجاہت، اپنی عزت و وقار، اپنا نام و نمود، اپنی خواہشات، اپنا عیش و آرام، اپنی آرائش و زیبائش —— ان ہی محبتوں کے ہم سب اسیر ہیں اور اسی چکر میں پھنسے ہوئے ہیں۔ الا ماشاء اللہ، شاذ ہی بلکہ آٹے میں نمک کی نسبت سے بھی قلیل ایسے خوش نصیب اور اللہ والے لوگ ہوں گے جو اس سطح سے بلند ہوں۔ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی محبت اور اس کی راہ میں جدوجہد اور محنت و کوشش، ایثار و قربانی تو بہت اُونچی بات ہے۔ میں نے اس نفسانی محبت سے بالاتر جو محبتیں گنوائیں، یعنی وطن و قوم کی محبت اور کسی نظریے اور نصب العین کی محبت تو ہماری عظیم اکثریت کی تو یہاں تک بھی رسائی نہیں ہے، جبکہ ان محبتوں پر بھی ایک سیرت تعمیر ہو جاتی ہے اور ایک وطن پرستانہ کردار، ایک قوم پرستانہ کردار اور ایک انقلابی اور مجاہدانہ کردار وجود میں آجاتا ہے، جس کے نقشے ہمیں دنیا میں نظر آتے ہیں۔ خلا تو ہمارے یہاں ہے کہ یہاں کوئی محبت ہی نہیں، سوائے اپنی محبت کے۔ اپنی ہی ذات کعبہ ہے جس کا ہم طواف کر رہے ہیں۔ اپنے ہی مفادات ہم کو سب سے زیادہ عزیز اور محبوب ہیں اور ہماری ساری تگ و دو اور دوڑ دھوپ اپنی ذات ہی کے گرد گھوم رہی ہے، اِلا ماشاء اللہ!

اب آپ دیکھئے کہ قرآن مجید میں ہمیں کس طرح ان محبتوں کا جائزہ لینے کا سبق دیا گیا ہے۔ سورۃ التوبہ کی آیت ۲۴ میں اس جائزہ کے لیے ہمارے سامنے ایک کسوٹی اور ایک معیار رکھا گیا ہے۔ اب میں اس کی ترجمانی اور شرح و تفصیل پیش کرتا ہوں۔ فرمایا: اے نبی ﷺ! کہہ دیجئے کہ اے ایمان لانے والو! اپنی محبتوں کا جائزہ لے لو اور اپنے باطن میں ایک ترازو نصب کرو۔ ایک پلڑے میں آٹھ محبتیں ڈالو (۱) اپنے باپوں کی محبت، (۲) بیٹوں کی محبت،

(۳) بھائیوں کی محبت' (۴) بیویوں کی محبت (ماں' بیٹی' بہن اور شوہر کی محبت انہی محبتوں کے تابع ہیں)' (۵) رشتہ داروں اور اعزہ و اقارب کی محبت۔ یہ وہ پانچ محبتیں ہیں جو علائقِ دنیوی سے متعلق ہیں' (۶) اُس مال کی محبت جو بڑے چاؤ سے جمع کیا ہے' (۷) اُس کاروبار کی محبت جو بڑی محنت سے تم نے جمائے ہیں' جس میں تمہارا خون پسینہ شامل ہے اور جس کے متعلق تم گھبراتے رہتے ہو کہ کہیں ماند نہ پڑ جائے' کہیں گھاٹا نہ ہو جائے' کہیں کساد بازاری نہ آ جائے' اور (۸) اُن مکانوں کی محبت جو تم نے بڑے ارمانوں سے بنائے ہیں اور ان کی آرائش و زیبائش میں پانی کی طرح پیسہ بہایا ہے۔ یہ تین محبتیں اسباب و سامانِ دُنیوی سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ کُل آٹھ محبتیں ہوئیں۔ اب سب کو ترازو کے ایک پلڑے میں ڈالو اور دوسرے پلڑے میں تین محبتیں: (۱) اللہ کی محبت' (۲) اُس کے رسول ﷺ کی محبت' اور (۳) اُس کی راہ میں جہاد کی محبت' جو بڑی dynamic محبت ہے' ڈالو۔ اب دیکھو کہ کون سا پلڑا جھکا؟ اگر علائق اور ساز و سامانِ دنیوی کی آٹھ محبتیں تمہارے قلب پر زیادہ مسلط ہیں ان تین محبتوں یعنی اللہ' رسول اور جہاد کی محبتوں سے اور پہلا پلڑا جھک گیا تو جاؤ دفع ہو جاؤ۔ ﴿فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۴﴾﴾ ''پس جاؤ اور گومگو اور انتظار کی حالت میں مبتلا رہو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے۔ اور اللہ ایسے فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

یہ ہیں ایک مسلم و مؤمن بندے کی تعمیرِ سیرت و کردار کی مثبت اساسات: اللہ کی محبت' رسول اللہ ﷺ کی محبت' اور جہاد کی dynamic محبت۔ یہ تین محبتیں اگر موجود ہیں تو یوں سمجھئے کہ تعمیرِ سیرت کا بنیادی پتھر (corner stone) یعنی جڑ اور بنیاد' اذہان و قلوب میں موجود ہے۔ (۷)

---

(۷) ''عشق'' کا لفظ اگرچہ قرآن و حدیث میں کہیں نہیں آیا' لیکن فارسی اور اردو شاعری میں عام طور پر اس محبت کے لیے ''عشق'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا دیکھئے کہ ہمارے دو عارفین نے محبتِ خداوندی کو کس طرح تعبیر کیا ہے۔ مولانا رومی فرماتے ہیں:

شاد باد اے عشقِ خوش سودائے ما
اے طبیبِ جملہ علت ہائے ما!

اور علامہ اقبال فرماتے ہیں:

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اوّلیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

انسانی جذبات کی دوسری نوعیت: جذبۂ خوف

میں نے عرض کیا تھا کہ انسان کے بنیادی جذبات دو نوعیتوں کے ہوتے ہیں' ایک مثبت جذبہ ہے' یعنی محبت کا جذبہ' اور دوسرا منفی جذبہ ہے' اور وہ خوف کا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ سب لوگ محبت کے رمز آشنا نہیں ہوتے' بلکہ ایسے افراد بہت کم ہوتے ہیں۔ اکثر کے بارے میں تو یہ محاورہ راست آتا ہے کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ اور ع ''نوارا تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کمیابی'' کے مصداق ہر کس و ناکس میں ذوقِ نغمہ نہیں ہوتا' چنانچہ تلخ نوائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ خشونت کی' دھمکی کی' وعید کی' ڈر اور خوف کی بھی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ اور واقعہ یہی ہے کہ لوگوں کی اکثریت اسی سطح پر ہوتی ہے۔ البتہ یہ دوسری بات ہے کہ کسی معاشرے کے رُخ کو متعین کرنے والی تو وہ اقلیت ہوتی ہے جو محبت کی رمز آشنا ہو اور اسی محبت کے مثبت جذبے سے سرشار ہو کر عمل کے میدان میں آئے۔ معاشرے کا رُخ یہی لوگ متعین کرتے ہیں' لیکن عوام کی عظیم اکثریت کے لیے دوسرے منفی محرک کی بھی ضرورت ہے اور وہ ہے خوف کا جذبہ۔

اب دیکھنا چاہیے کہ دنیا میں انسانی ذہن کے بنائے ہوئے رائج الوقت نظام ہائے فکر و عمل میں اس خوف کے جذبے کو کس طرح بروئے کار لایا گیا ہے! یہ نظام ہم سب کے سامنے ہیں۔ یہ تعزیرات اور قوانین' جواب دہی اور محاسبہ' مقدمہ اور تفتیش' پولیس اور عدالت' ہتھکڑیاں اور بیڑیاں' جیل اور پھانسی' یہ سب کچھ اسی خوف کے جذبے کے لیے تادیب و تعزیر اور احتساب کے نظام کے مظاہر ہیں اور یہ پورا نظام اسی خوف کے منفی جذبے کو زندہ و تازہ رکھنے کے لیے ہے۔ جو لوگ محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر برائی اور غلط کام سے نہ رُک پائیں' ان کو غلط کاری سے باز رکھنے کے لیے خوف کے طور پر سزا کا یہ نظام موجود ہے۔

◄◄ اور ؎

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں' راکھ کا ڈھیر ہے!

اور ؎

صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق' صبرِ حسینؓ بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق!

(مرتب)

اسلام کا تعزیراتی نظام اور اس کے اصول

اسلام نے اس کو بھی اختیار اور employ کیا ہے اور بڑی شدت سے کیا ہے' بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے جس طرح اس کو استعمال کیا ہے' موجودہ دنیا اس کو اس طرح استعمال کر بھی نہیں رہی۔ یہی وجہ ہے کہ متمدّن ترین ممالک میں جرائم کا معاملہ کنٹرول میں نہیں آ رہا اور بڑے دہشت ناک اور سنگین نوعیت کے جرائم کا ارتکاب یورپ بالخصوص امریکہ میں عام ہو رہا ہے اور ان میں کمی کے بجائے روز بروز اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جرائم کے لیے اسلام نے جو حدود و تعزیرات اور سزاؤں کے ضوابط رکھے ہیں وہ بڑے شدید ہیں۔ (۸) چنانچہ جو لوگ اسلامی سزاؤں میں شدت کے اصل و اساسی فلسفہ اور حکمت کو سمجھ نہیں پاتے وہ ان کو وحشیانہ و بہیمانہ سزائیں قرار دے دیتے ہیں۔ اسلام میں سزاؤں میں شدت فاطر فطرت نے دراصل عبرت پذیری کے لیے رکھی ہے' لہٰذا ان کو درحقیقت عبرتناک سزائیں کہنا صحیح ہوگا۔ اور اس کی اصل حکمت یہی ہے کہ لوگ عبرت پکڑیں اور جرائم سے باز رہیں۔ ساتھ ہی اسلام چونکہ عادلانہ نظام کا عَلَم بردار ہے لہٰذا اس میں شک کا فائدہ ملزم کو پہنچتا ہے۔ (واضح رہے کہ یہ لفظ ملزم نہیں' ملزم ہے۔ یعنی وہ شخص جس پر الزام لگایا گیا ہو۔)

اس پس منظر میں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ دنیا میں اسلام ہی وہ ضابطہ حیات ہے جس نے دُنیا کو اس اصول سے متعارف کرایا کہ شک کا فائدہ ملزم کو ملے گا۔ اس ضمن میں نبی اکرم ﷺ کی تعلیم تو اس حد تک ہے کہ ''شک کا فائدہ اُٹھا کر اگر سو مجرم چھوٹ جائیں تو کوئی حرج نہیں ہے' لیکن کسی بے گناہ کو سزا نہ ہو جائے''۔ موجودہ دُنیا میں ملزم کو شک کا فائدہ دینے کا جو اصول رائج ہے یہ درحقیقت ابتداءً رحمۃ للعالمین ﷺ ہی کا عطا کردہ (initiated) ہے۔ پھر یہ اصول بھی حضور ﷺ ہی کا دیا ہوا ہے کہ جب تک دونوں فریقوں کی بات نہ سن لو' فیصلہ نہ کرو۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ دونوں کو سنا جائے اور ثبوت یا تردید اور صفائی کا فریقین کو پورا موقع دیا جائے۔ یہ اصول کس نے مرحمت کیا کہ بارِ ثبوت مدّعی پر ہے' مدّعا علیہ پر نہیں ہے۔ اگر میں یہ کہتا ہوں کہ ''یہ چیز'' میری ہے تو مجھے ثابت کرنا ہوگا کہ جس چیز کی ملکیت کا دعویٰ ہے فی الحقیقت وہ میری ہے۔ جس شخص کے قبضے میں میری کوئی چیز ہے اس سے یہ نہیں

(۸) یہی وجہ ہے کہ سعودی عرب جہاں اسلامی شریعت کی حدود و تعزیرات جاری ہیں' وہاں جرائم کا تناسب دنیا کے تمام ممالک کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے۔

کہا جائے گا کہ وہ ثابت کرے کہ وہ چیز اس کی ہے۔ اگر مدعی ایسا ثبوت یا معتبر شہادت پیش کرنے سے قاصر ہو تو زیادہ سے زیادہ مدعا علیہ سے قسم لے کر مقدمہ خارج کر دیا جائے گا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کا یہ مشہور واقعہ ہے کہ آں جنابؓ کی زرہ چوری ہو گئی تھی جو ایک یہودی کے قبضے میں پائی گئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قاضی شُریح کی عدالت میں دعویٰ دائر کیا۔ قاضی نے ثبوت طلب کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شہادت میں اپنے صاحبزادے حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور اپنے غلام قنبر کو پیش کیا۔ لیکن قاضی شُریح نے اس بنیاد پر مقدمہ خارج کر دیا کہ باپ کے حق میں بیٹے کی اور آقا کے حق میں غلام کی گواہی قابلِ قبول نہیں ہے۔ حالانکہ ذاتی طور پر وہ جانتے تھے کہ خلیفۂ وقت' دامادِ نبی اپنے دعویٰ میں سچے ہیں اور گواہ بھی جھوٹ نہیں بول رہے۔ لیکن انصاف کے لیے جو شرائط ہیں ان کو حضرت علی رضی اللہ عنہ پورا نہ کر سکے۔ یہ عادلانہ بات دیکھ کر وہ یہودی مسلمان ہو گیا۔

حدود و تعزیرات کی حکمت: عبرت پذیری اور سبق آموزی

یہ سارے اصول جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عطا کردہ ہیں۔ لیکن جب ملزم پر ان ساری رعایتوں کے باوصف جرم ثابت ہو جائے تو اب اس کو سزا انتہائی شدید ملنی چاہیے تاکہ ایک کو سزا ملے اور لاکھوں افراد تھرا اُٹھیں اور ان کو عبرت حاصل ہو۔ قرآن مجید میں تو یہ فلسفہ قتال کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ سورۃ الانفال میں فرمایا: ﴿فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝۵۷﴾ ''پس اگر آپؐ ان (معاہدہ توڑنے والے کفار) کو جنگ میں پا جائیں تو ان کی ایسی خبر لیں کہ جو ان کے پیچھے ہیں (معاہدہ توڑنے اور جنگ کی ترغیب دینے والے) ان کو بھی خوف زدہ کر دیں' تاکہ وہ عبرت حاصل کریں''۔ ہوتا یہ تھا کہ دعوتِ اسلامی کو کچلنے کے لیے عوام الناس کو جنگ پر آمادہ کرنے کے لیے بڑے بڑے سرداران اور چودھری پیچھے بیٹھے سازشیں کیا کرتے تھے' جن میں یہودیوں کے سردار پیش پیش رہتے تھے' بلکہ اصل سازشی لوگ یہی تھے۔ دوسروں کی حیثیت تو اکثر کٹھ پتلیوں کی ہوتی تھی۔ یہود ہی ان کو ورغلاتے اور حملہ کے لیے بلاتے تھے' کیونکہ وہ خود تو حب دنیا کی وجہ سے انتہائی بزدل ہو چکے تھے اور کھلے میدان میں نکل کر مردانہ وار جنگ کرنے کی جرأت ہی نہیں کرتے تھے۔ ان کی اس بزدلی پر قرآن مجید میں بایں الفاظ تبصرہ کیا گیا ہے: ﴿لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ ؕ﴾ (الحشر: ۱۴) ''(اے مسلمانو!) یہ یہود کبھی اکٹھے ہو کر

(کھلے میدان میں) تم سے جنگ نہیں کریں گے' لڑیں گے بھی تو قلعہ بند گڑھیوں میں بیٹھ کر یا دیواروں کے پیچھے چھپ کر (پتھراؤ کی صورت میں)''۔ اسی لیے حکم دیا گیا کہ اے مسلمانو! جو کفار حملہ آور ہو کر جنگ کے لیے آتے ہیں ان کی ایسی سرکوبی کرو اور درگت بناؤ کہ ان کے پیچھے بیٹھے جو لوگ سازشیں کرتے رہتے ہیں ان کے بھی ہوش ٹھکانے آ جائیں اور ان کو سبق مل جائے۔ تو جنگ کا معاملہ بھی یہی ہے اور حدود و تعزیرات اور سزا کا معاملہ بھی یہی ہے' خواہ دنیا ان کو بڑی ہی وحشیانہ سزائیں کہہ لے۔

بلاشبہ اسلام کی حدود شدید ترین ہیں' اس لیے کہ ان کی حکمت عبرت پذیری اور سبق آموزی ہے۔ پھر یہ اصول بھی رکھا گیا ہے کہ ان حدود کو برسرِ عام نافذ کیا جائے' کیونکہ پائیدار عبرت اسی طور پر حاصل ہو سکتی ہے۔ شادی شدہ مرد و عورت کے لیے زنا کی سزا رجم (سنگ ساری کے ذریعے ہلاک کرنا) حد[9] ہے۔ اس سے قطع نظر کہ اس کا حکم قرآن میں ہے یا نہیں' کوئی بھی انصاف پسند شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ نبی اکرم ﷺ نے اسے حد قرار دیا ہے اور اپنے دورِ سعید میں اس حد کو جاری فرمایا ہے۔ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے عہد زرّیں میں بھی یہ حد جاری ہوئی ہے۔ تمام ائمہ و فقہاءِ امت کا اس پر اجماع ہے کہ رجم حد ہے' اس میں کمی بیشی ہرگز نہیں کی جا سکتی۔ 'تعزیرات' وہ سزائیں ہیں جن میں حالات کے مطابق کمی بیشی کی جا سکتی ہے۔ گویا تعزیرات کا معاملہ ایک اسلامی مملکت میں مقنّنہ (legislature) کا میدانِ کار بھی ہے۔ یعنی قرآن و سنت کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے ان جرائم کے علاوہ جو ''حدود'' کے دائرے کے اندر ہیں' مقنّنہ تعزیرات مقرر کر سکتی ہے۔ لیکن 'حدود' میں کمی بیشی کا کوئی مجاز نہیں ہے۔ شادی شدہ مرد و عورت کے لیے زنا کی سزا رجم 'حد' ہے۔ سرقہ کی سزا قطع ید 'حد' ہے۔ غیر شادی شدہ مرد و عورت کے لیے زنا کے ارتکاب پر سو سو کوڑے کی سزا 'حد' ہے۔ قذف کی سزا اسّی (۸۰) کوڑے 'حد' ہے۔ مرتد کی سزا قتل 'حد' ہے۔ اور حکمت دین یہ ہے کہ ان تمام 'حدود' کا نفاذ برسرِ عام ہو' تاکہ معاشرہ واقعتاً ان سے عبرت پکڑ سکے اور سبق لے سکے۔

مؤثّر ترین خوف: خوفِ آخرت

اسلام نے حدود و تعزیرات کے ذریعے خوف کے منفی جذبے کو پیدا کرنے کا بھرپور اہتمام

(۹) حد جس کی جمع حدود ہے' دینی اصطلاح میں وہ سزائیں ہیں جو قرآن و سنت نے مقرر کر دی ہیں۔ (مرتّب)

کیا ہے' لیکن اسلام انسان کے دل میں جو اصل خوف قائم کرنا چاہتا ہے وہ ''خوفِ آخرت'' ہے۔ دُنیوی احتساب اور سزا سے بچنے اور اس خوف کے مضمحل ہونے کے تو بہت سے چور دروازے ہیں۔ بدعنوانی اور بے ایمانی (corruption) عام ہوگئی ہے' پولیس ہے تو رشوت لینے والی' عدالتی نظام ہے تو عدل وانصاف سے عاری۔ پھر اثر ورسوخ اور سفارشات کا وسیع سلسلہ ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہ سارے خوف بے اثر ہوگئے۔ اوّل تو جرم میں پکڑے جانا ہی محلِ نظر ہے اور اگر پکڑے بھی گئے تو There is many a slip between the cup and the lip کے مصداق بچ نکلنے کی بہت سی شکلیں ہیں' رشوت ہے' سفارش ہے' جھوٹی شہادتوں کا بندوبست ہے۔ ایک انگریزی نظم کا مصرعہ ہے:

Art, Glory, Freedom fail, but Nature still is fair.

اسی طرح سمجھئے کہ دنیوی خوف سارے ختم ہو سکتے ہیں' لیکن آخرت کا حقیقی خوف دل میں ایک مرتبہ واقعی قائم ہو جائے تو کبھی ختم نہیں ہوگا۔ یہ یقین مطلوب ہے کہ ایک آنکھ ہر وقت دیکھنے والی ہے' اس سے چھپنا قطعی ناممکن ہے۔ ایک عدالت ہے جہاں نہ کوئی سفارش ہے' نہ رشوت ہے' نہ فدیہ ہے' نہ دوستی کام آنے والی ہے' جہاں کوئی ساتھی اور مددگار نہیں ہوگا۔ سورۃ البقرۃ میں یہ بات بنی اسرائیل سے دو مرتبہ تھوڑے سے لفظی فرق کے ساتھ فرمائی گئی۔ چھٹے رکوع میں فرمایا:

﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿٤٨﴾﴾

''اور ڈرو اُس دن سے جب کوئی کسی کے ذرا کام نہ آئے گا' نہ کسی کی طرف سے سفارش قبول ہوگی' نہ کسی کو فدیہ لے کر چھوڑا جائے گا اور نہ مجرموں کو کہیں سے مدد مل سکے گی۔''

پھر آگے پندرہویں رکوع میں فرمایا:

﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿٣٣﴾﴾

''اور ڈرو اُس دن سے جب کوئی کسی کے ذرا کام نہ آئے گا' نہ کسی سے فدیہ قبول کیا جائے گا' نہ کوئی سفارش ہی آدمی کو فائدہ دے گی اور نہ مجرموں کو کہیں سے کوئی مدد پہنچ سکے گی۔''

پھر اسی سورۃ البقرۃ کے چونتیسویں (۳۴) رکوع میں اہلِ ایمان سے خطاب فرما کر اسی بات کا اعادہ کیا گیا' فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۭ﴾ (آیت ۲۵۴)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جو کچھ مال و متاع ہم نے تم کو بخشا ہے اس میں سے خرچ کرو، قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی، نہ دوستی کام آئے گی اور نہ سفارش چلے گی۔''

اسی مقصد کے لیے میں نے آغازِ خطاب میں سورۃ العلق کی تین آیات کی تلاوت کی تھی: ﴿كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۝ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۝ اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ۝﴾ ان میں سے پہلی آیت کی ترجمانی یوں ہوگی کہ ''ہرگز نہیں! انسان سرکشی پر، تعدّی پر، عدوان پر، ظلم پر، دست درازی پر، آمادہ ہو ہی جاتا ہے''۔ طغٰی ہی سے لفظ طغیان اور طغیانی بنا ہے۔ آخر الذکر لفظ طغیانی اُردو میں کافی مستعمل ہے۔ ع ''دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام!'' دریا اپنی حد میں ہے تو ٹھیک ہے، آگے نکل جائے تو یہی طغیانی ہے۔ انسان اپنے حق پر قانع رہے، اپنی حد سے آگے نہ بڑھے تو یہ عدل و انصاف پر مبنی صحیح رویہ ہے۔ لیکن اگر اپنے حق سے تجاوز کر کے کسی دوسرے کے حق پر منہ مارا اور دست درازی کی اور اپنی حد سے تجاوز کر کے کسی دوسرے کی حد میں دخل اندازی کی تو یہ طغیانی ہے۔ لہٰذا فرمایا: ﴿كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۝﴾ ''ہرگز نہیں! انسان سرکشی اور طغیانی پر آمادہ ہو جاتا ہے''۔ کیوں؟ اس کا سبب اگلی آیت میں بیان ہوتا ہے۔ فرمایا: ﴿اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۝﴾ ''اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز دیکھتا ہے''۔ مطلب یہ ہوا کہ برائی اور معصیت پر یہاں پکڑ نہیں ہوتی۔ انسان دیکھتا ہے کہ میں نے جھوٹ بولا تو زبان پر چھالا بھی نہیں پڑا۔ میں نے کسی کو دھوکہ دیا تو مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ میں نے حرام طریقے سے حاصل کیا ہوا مال ہڑپ کیا تو مجھے بدہضمی بھی نہیں ہوئی بلکہ وہ رچ پچ گیا۔ میں نے ناجائز ذرائع سے دولت کمائی، خوب رشوت لی اور رشوت دے کر اپنے حق سے زیادہ حاصل کیا، کسانوں اور مزدوروں کا استحصال کیا اور اپنا status بلند کیا، لیکن معاشرے میں میری بدنامی ہونا تو درکنار، میری شہرت، وجاہت اور عزت و وقار میں اضافہ ہی ہوا۔ لوگ مجھے جھک کر سلام کرتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ دنیا میں اخلاقی برائیوں کی پاداش کا قانون نافذ نہیں ہے۔ طبعی قانون (physical law) بہرحال نافذ ہے۔ یہ وہ بات ہے جو انسان کو بداخلاقی، سرکشی اور جائز حدود سے تجاوز کرنے پر آمادہ کر ہی لیتی ہے۔ اس کا علاج کیا ہے؟ اس کو اگلی آیت میں بیان فرمایا: ﴿اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ۝﴾ ''یقیناً تیرے رب ہی کی طرف لوٹنا

ہے''۔ یہ یقین اگر انسان کے قلب میں جاگزیں ہو جائے تو طغیانی اور سرکشی کیسے ہو؟ یہ معلوم ہو کہ سب کھایا پیا اُگلنا پڑے گا تو انسان حرام کیسے کھائے گا؟ یہ یقین ہو کہ زندگی کے تمام اعمال کا آخرت میں محاسبہ ہوگا' جواب دہی کرنی ہوگی تو انسان بے نیازی کا رویہ کیسے اختیار کرے گا؟

قرآن مجید میں انذارِ آخرت کی مثالیں

یہ بات اچھی طرح جان لیجیے کہ ایمان بالآخرت پر قرآن نے سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ ابتدائی مکی سورتوں کا مرکز و محور انذارِ آخرت ہے۔ وہی بات کہ ع ''نوا را تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کمیابی!'' تاکہ آخرت اور اس کے محاسبے کا خوف انسان کے قلوب و اذہان میں پوری طرح جاگزیں ہو' وہاں کی پکڑ کا احساس اور جواب دہی کا استحضار رہے۔ اسی انذارِ آخرت کی کیفیت کا نقشہ مولانا حالی مرحوم نے اس شعر میں کھینچا ہے کہ ؎

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادیؐ
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی

جب نبی اکرم ﷺ نے حکم ربانی ﴿قُمْ فَاَنْذِرْ﴾ کی تعمیل میں اہلِ مکہ کے سامنے وحی الٰہی پیش کی' جس میں دعوتِ توحید اور دعوتِ ایمان بالرسالت کے ساتھ انذارِ آخرت پر سب سے زیادہ زور تھا اور اس پر ایمان لانے کی پُرزور اور پُرتاثیر دعوت تھی۔ قیامت' میدانِ حشر اور احتساب کے احوال اور شدائد کا بیان انتہائی پُرتاثیر' پُرجلال' پُرہیبت اور دلوں کو لرزاں و ترساں کرنے والے بلیغ انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ جیسے:

﴿اَلْقَارِعَةُ ۝١ مَا الْقَارِعَةُ ۝٢ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ۝٣ يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۝٤ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ۝٥ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝٦ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝٧ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝٨ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝٩ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَاهِيَهْ ۝١٠ نَارٌ حَامِيَةٌ ۝١١﴾ (القارعة)

''عظیم حادثہ! کیا ہے وہ عظیم حادثہ؟ تم کیا جانو کہ وہ عظیم حادثہ کیا ہے؟ وہ دن جب لوگ بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح اور پہاڑ رنگ برنگ کے دھنکے ہوئے اُون کی طرح ہوں گے۔ پھر جس کے پلڑے بھاری ہوں گے وہ دل پسند عیش میں ہوگا۔ اور جس کے پلڑے ہلکے ہوں گے اس کی جائے قرار کھائی ہوگی۔ اور تمہیں کیا خبر کہ وہ کیا چیز ہے؟ بھڑکتی ہوئی آگ!''

قیامت میں نفسی نفسی کے عالَم کا نقشہ سورۃ المعارج میں بایں الفاظ کھینچا گیا:

﴿يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ ۝٨ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ۝٩ وَلَا يَسْئَلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ۝١٠ يُّبَصَّرُوْنَهُمْ ۭ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍۢ بِبَنِيْهِ ۝١١ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ۝١٢ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُــْٔوِيْهِ ۝١٣ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ ثُمَّ يُنْجِيْهِ ۝١٤ كَلَّا ۭ اِنَّهَا لَظٰى ۝١٥ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ۝١٦ تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى ۝١٧ وَجَمَعَ فَاَوْعٰى ۝١٨﴾

''(وہ عذاب اس روز ہوگا) جس روز آسمان پگھلی ہوئی چاندی کی طرح ہوگا۔ اور پہاڑ رنگ برنگ کے دھنکے ہوئے اُون جیسے ہو جائیں گے۔ اور کوئی جگری دوست اپنے جگری دوست کو نہ پوچھے گا۔ حالانکہ وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے۔ مجرم چاہے گا کہ اس دن کے مذاب سے بچنے کے لیے اپنی اولاد کو' اپنی بیوی کو' اپنے بھائی کو' اپنے قریب ترین خاندان کو جو اسے پناہ دینے والا تھا' اور روئے زمین کے سب لوگوں کو فدیہ میں دے دے اور یہ تدبیر اسے نجات دلا دے۔ ہرگز نہیں! وہ تو بھڑکتی ہوئی آگ کی لپٹ ہوگی۔ جو گوشت پوست کو چاٹ جائے گی۔ پکار پکار کر اپنے ربّ کی طرف بلائے گی ہر اُس شخص کو جس نے حق سے منہ موڑا اور پیٹھ پھیری۔ اور مال جمع کیا اور سینت سینت کر رکھا۔''

احوالِ قیامت اور اس کے شدائد و مصائب کے نقشے مختلف اسالیب سے مکّی سورتوں میں کھینچے گئے۔ چند مزید سن لیجیے۔ سورۂ عبس کے آخر میں فرمایا:

﴿يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ۝٣٤ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ۝٣٥ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ۝٣٦ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ۝٣٧ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ۝٣٨ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۝٣٩ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۝٤٠ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۝٤١ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ۝٤٢﴾

''اُس روز آدمی اپنے بھائی' اور اپنی ماں اور اپنے باپ' اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا۔ ان میں سے ہر شخص پر اُس دن ایسا وقت آ پڑے گا کہ اسے اپنے سوا کسی کا ہوش نہ ہوگا۔ کچھ چہرے اُس روز دمک رہے ہوں گے۔ ہشاش بشاش اور خوش و خرم ہوں گے۔ اور کچھ چہروں پر اُس روز خاک اُڑ رہی ہوگی' اور کلونس چھائی ہوئی ہوگی۔ یہی کافر و فاجر لوگ ہوں گے۔''

سورۃ القیامہ میں استفہامیہ انداز میں فرمایا: کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ یونہی سرکش اونٹ کی طرح بے مہار چھوڑ دیا جائے گا؟ ﴿اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَكَ سُدًی ﴿۳۶﴾﴾ اس سے اس دنیوی زندگی کا حساب نہیں لیا جائے گا؟ اور سورۃ المؤمنون میں فرمایا: ﴿اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَیْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱۵﴾﴾ ''کیا تم نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں یوں ہی بے کار پیدا کیا تھا اور یہ کہ تمہیں ہماری طرف لوٹ کر آنا نہیں ہے؟'' اس کا جواب سورۃ الانفطار میں بایں الفاظ دیا گیا: ﴿وَاِنَّ عَلَیْكُمْ لَحٰفِظِیْنَ ﴿۱۰﴾ كِرَامًا كَاتِبِیْنَ ﴿۱۱﴾ یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۱۲﴾﴾ ''اور یقیناً تم پر (ہماری طرف سے) نگران مقرر ہیں' معزز لکھنے والے۔ وہ جانتے ہیں جو کچھ تم لوگ کرتے ہو''۔ اور سورۂ ق میں فرمایا گیا: ﴿مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ ﴿۱۸﴾﴾ ''وہ کوئی بات منہ سے نہیں نکالنے پاتا مگر اس کے پاس ایک حاضر باش نگران (فرشتہ لکھنے کو تیار رہتا) ہے۔''

سورہ الکہف میں میدانِ حشر کا نقشہ بایں الفاظ کھینچا گیا:=

﴿وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَی الْمُجْرِمِیْنَ مُشْفِقِیْنَ مِمَّا فِیْهِ وَیَقُوْلُوْنَ یٰوَیْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا یُغَادِرُ صَغِیْرَةً وَّلَا كَبِیْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ؕ وَلَا یَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴿۴۹﴾﴾

''اور نامۂ اعمال سامنے رکھ دیا جائے گا' اُس وقت تم دیکھو گے کہ مجرم لوگ اپنی کتابِ زندگی کے اندراجات سے ڈر رہے ہوں گے اور کہہ رہے ہوں گے کہ ہائے ہماری کم بختی' یہ کیسی کتاب ہے کہ ہماری کوئی چھوٹی اور بڑی حرکت ایسی نہیں رہی جو اس میں درج نہ ہوگئی ہو۔ جو کچھ انہوں نے کیا تھا' وہ سب اپنے سامنے حاضر پائیں گے' اور تیرا رب کسی پر ذرا ظلم نہ کرے گا۔''

بعث بعد الموت پر کفار کے اعتراضات

میں نے صرف چند مثالیں پیش کی ہیں جن سے ایمان بالآخرت کی غیر معمولی اہمیت کا پتا چلتا ہے — لیکن ہوا یہ کہ مکہ میں ان اخبار و احوالِ قیامت و آخرت اور محاسبے سے ایک ہلچل مچ گئی۔ ان کے حاشیہ خیال اور تصور میں یہ بات آتی ہی نہیں تھی کہ مرنے کے بعد پھر جی اُٹھنا ہے۔ انہوں نے اس کا مختلف انداز میں مذاق اُڑانا شروع کیا اور چہ میگوئیاں شروع کر دیں۔ وہ استفہامی انداز میں اس خبر کا استہزا کیا کرتے تھے۔ ان کی ان مختلف باتوں کا مختلف انداز

میں قرآن مجید میں ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۃ النمل میں ان کافروں کا قول نقل ہوا:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ءَ اِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّاٰبَآؤُنَآ اَئِنَّا لَمُخْرَجُوْنَ ۝ لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝﴾

''اور جن لوگوں نے کفر (کا راستہ) اختیار کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ کیا جب ہم اور ہمارے باپ دادا (گل سڑ کر) مٹی ہو جائیں گے تو ہمیں (قبروں سے) نکالا جائے گا؟ ایسے وعدے تو پہلے سے ہم سے اور ہمارے باپ دادوں سے ہوتے چلے آئے ہیں۔ یہ تو بس اگلوں کی کہانیاں ہیں (جو نقل ہوتی چلی آ رہی ہیں)۔''

سورۃ المؤمنون میں تھوڑے سے فرق کے ساتھ مشرکین و کفارِ مکّہ کا یہ اعتراض نقل ہوا:

﴿قَالُوْٓا ءَ اِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَ اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۝﴾ ''کہتے ہیں کہ جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گی تو کیا ہم (پھر زندہ کر کے) اٹھائے جائیں گے؟'' اسی سورہ میں دہریوں کا بھی قول نقل ہوا۔ یہ وہ بات ہے جو تمام خدا ناآشنا قدیم و جدید فلسفوں میں اصل الاصول کی حیثیت رکھتی ہے:

﴿اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ۝ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ۝ اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ۝﴾ (المؤمنون)

''کیا یہ (نبی) تم سے یہ وعدہ کرتا (اور تمہیں خبر دیتا) ہے کہ جب تم مر کر مٹی ہو جاؤ گے اور جب تمہاری ہڈیاں بھی گل سڑ کر رہ جائیں گی تو پھر تم کو (قبروں سے) نکالا جائے گا؟ یہ وعدہ بعید ہے بلکہ بعید از قیاس ہے۔ زندگی کچھ نہیں ہے مگر بس اسی دنیا کی زندگی۔ ہم یہاں خود مرتے ہیں اور خود جیتے ہیں۔ اور ہم ہرگز اُٹھائے جانے والے نہیں ہیں۔''

سورۃ الجاثیہ (آیت ۲۴) میں ان دہریوں کا قول ایک دوسرے اسلوب سے نقل ہوا:

﴿وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ﴾

''اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی بس اسی ہماری دنیا کی زندگی ہے۔ یہیں ہم خود جیتے اور خود مرتے ہیں اور گردشِ ایام کے سوا ہمیں کوئی چیز ہلاک نہیں کرتی۔''

متعدد سورتوں میں آخرت کے بارے میں کفار و مشرکین کی کٹ حجتی کا ذکر کیا گیا ہے۔ چند مثالیں مزید سن لیجیے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا: ﴿وَقَالُوْٓا ءَ اِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَ اِنَّا

لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا﴿۴۹﴾﴾ ''اور وہ کہتے ہیں کہ جب ہم (مرنے کے بعد گل سڑ کر) ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا ہم ازسرِنو پیدا کر کے اٹھا کھڑے کیے جائیں گے؟'' سورۂ یٰسٓ میں اپنی قدرت کے ساتھ ہی انسان کی حجت بازی کا بھی ذکر فرما دیا: ﴿اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ﴿۷۷﴾﴾ ''کیا انسان نے (اس بات پر) نظر نہیں کی کہ ہم نے اُس کو نطفے سے پیدا کیا' بایں ہمہ وہ کھلم کھلا جھگڑالو بن (کر کھڑا ہو) گیا!''

اعتراضاتِ کفار کے جوابات

قرآن حکیم نے ان تمام اعتراضات کے مختلف اسالیب سے نہایت مدلّل اور جامع جوابات دیے ہیں۔ بطور مثال چند جوابات پیش کیے دیتا ہوں۔ سورۂ یٰسٓ میں وارد اعتراض کے جواب میں فرمایا: ﴿قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ﴿۷۹﴾﴾ ''(اے نبی ﷺ!) ان سے کہہ دو کہ ان کو وہی ذات دوبارہ زندہ کرے گی جس نے ان کو پہلی بار پیدا کیا تھا''۔ غور کیجیے کہ کتنی مسکت اور معقول دلیل ہے۔ سورۂ قٓ میں فرمایا: ﴿اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ ۭ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ﴿۱۵﴾﴾ ''(لوگو! غور کرو) کیا ہم پہلی بار کی تخلیق سے عاجز تھے! مگر یہ لوگ دوبارہ کی تخلیق کے بارے میں شک میں پڑے ہوئے ہیں''۔

اسی سورۂ قٓ میں مزید فرمایا:

﴿وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ﴿۴۱﴾ يَّوْمَ يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوْجِ﴿۴۲﴾ اِنَّا نَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَاِلَيْنَا الْمَصِيْرُ﴿۴۳﴾ يَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ۭ ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيْرٌ﴿۴۴﴾﴾

''اور سنو جس دن منادی کرنے والا (ہر شخص کے) قریب ہی سے پکارے گا۔ جس دن سب لوگ آوازۂ حشر کو ٹھیک ٹھیک سن رہے ہوں گے' وہ زمین سے مُردوں کے نکلنے کا دن ہوگا۔ یقیناً ہم ہی زندگی بخشتے ہیں اور ہم ہی موت دیتے ہیں اور ہماری طرف ہی اُس دن سب کو پلٹنا ہے جب زمین پھٹے گی اور لوگ اس کے اندر سے نکل کر تیز تیز بھاگے جا رہے ہوں گے۔ یہ حشر ہمارے لیے بہت آسان ہے۔''

سورۃ الانشقاق میں فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ۝ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۝ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ۝ وَّيَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ

مَسۡرُوۡرًا ﴿۹﴾ وَاَمَّا مَنۡ اُوۡتِیَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهۡرِهٖ ﴿۱۰﴾ فَسَوۡفَ يَدۡعُوۡا ثُبُوۡرًا ﴿۱۱﴾
وَّيَصۡلٰى سَعِيۡرًا ﴿۱۲﴾ اِنَّهٗ كَانَ فِىۡۤ اَهۡلِهٖ مَسۡرُوۡرًا ﴿۱۳﴾ اِنَّهٗ ظَنَّ اَنۡ لَّنۡ يَّحُوۡرَ ﴿۱۴﴾
بَلٰٓى ۛۚ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيۡرًا ﴿۱۵﴾

''اے انسان! تو کشاں کشاں اپنے رب کی طرف چلا جا رہا ہے اور اس سے ملنے والا ہے۔ پھر جس کا نامۂ اعمال اس کے سیدھے ہاتھ میں دیا گیا' تو اس سے ہلکا حساب لیا جائے گا اور وہ اپنے لوگوں کی طرف خوش خوش پلٹے گا۔ رہا وہ شخص جس کا نامۂ اعمال اس کی پیٹھ کے پیچھے دیا جائے گا تو وہ موت کو پکارے گا' اور بھڑکتی ہوئی آگ میں جا پڑے گا۔ وہ اپنے گھر والوں میں مگن تھا۔ اس نے سمجھا تھا کہ اس نے کبھی پلٹنا نہیں۔ پلٹنا کیسے نہ تھا؟ اس کا رب اس کے کرتوت دیکھ رہا تھا۔''

الغرض جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ ابتدائی مکی سورتوں کا مرکز ومحور انذار ہے' تاکہ نیند کے ماتے جاگیں' اور اُن کو معلوم ہو جائے کہ زندگی صرف یہی زندگی نہیں ہے' بلکہ مرنے کے بعد ان کو پھر زندہ کیا جائے گا اور ان کو عدالت خداوندی میں محاسبہ کے لیے پیش ہونا ہوگا۔ آخرت کی پیشی' جواب دہی اور جزا وسزا کا اگر انسان کو واقعی دلی یقین حاصل ہو جائے اور اس کے قلوب واذہان میں راسخ اور جاگزیں ہو جائے تو یہ خوف کا جذبہ دنیا میں اس کو ایک بہترین انسان دوست شخصیت بننے میں انتہائی مؤثر ثابت ہوگا۔

تعمیرِ سیرت وکردار کے لیے ناگزیر: حُبِ الٰہی اور خوفِ آخرت

اسلام انسان کے قلوب واذہان میں اللہ کی محبت کا مثبت جذبہ اور آخرت میں اللہ کی ناراضگی اور اس کی پکڑ کے خوف کا منفی جذبہ پیدا کر کے اس کی ایسی تعمیرِ سیرت وکردار کرتا ہے کہ ایسا انسان ایک طرف نیکی اور بھلائی کا پیکر بن جاتا ہے' دوسری طرف انسان دوستی' انسانی ہمدردی' قوم ووطن کی محبت بھی اس کے وجود میں موجود رہتی ہے۔ چنانچہ یہ نقشہ ہمیں صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی زندگیوں اور خلافت راشدہ کی حکومت کے دورِ سعید میں بکمال وتمام نظر آتا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ انسانوں کی اکثریت ع ''نوا را تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کمیابی'' کے مصداق خوف کے جذبے سے زیادہ محتاط رہتی ہے۔ اسی لیے اسلام نے اس جذبے پر نہایت زور دیا ہے اور اسے emphasise کیا ہے۔ سورۃ النّٰزِعٰت میں قیامت و آخرت کے نقشے کے بارے میں فرمایا:

﴿فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ﴿٣٤﴾ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ﴿٣٥﴾ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ﴿٣٦﴾ فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ﴿٣٧﴾ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿٣٨﴾ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿٣٩﴾ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿٤٠﴾ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿٤١﴾﴾

''پھر جب وہ ہنگامۂ عظیم برپا ہوگا۔ جس روز انسان اپنا سب کیا دھرا یاد کرے گا' اور ہر دیکھنے والے کے سامنے دوزخ کھول کر رکھ دی جائے گی۔ چنانچہ جس نے سرکشی کی تھی' اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تھی' تو دوزخ ہی اس کا ٹھکانا ہوگی۔ اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا اور نفس کو بری خواہشات سے باز رکھا تھا' تو جنت ہی اس کا ٹھکانا ہوگی۔''

جب وہ بڑی آفت یعنی قیامت و آخرت کی گھڑی آئے گی' جس روز انسان اپنا سب کیا دھرا یاد کرے گا اور ہر دیکھنے والے کے سامنے دوزخ نمایاں کر کے رکھ دی جائے گی تو جس انسان نے دنیا کی زندگی میں سرکشی کی تھی' اپنی حدود سے تجاوز کیا تھا اور جس نے دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تھی اور علائق و اسبابِ زندگی کی محبتوں ہی کے پیچھے لگا رہا تھا تو ایسے خودغرض و خود پرست کے لیے دوزخ ہی ٹھکانا ہوگی۔ اور جس نے دل میں اپنے رب' اپنے مالک' اپنے آقا کے سامنے کھڑے ہو کر جواب دہی اور محاسبے کا خوف کیا تھا اور نفس کو ضبط میں رکھا تھا' اس کو نفسانی خواہشات سے روکے رکھا تھا تو ایسے شخص کا ٹھکانا جنت ہوگی۔ غور کیجئے کہ یہاں ﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿٤٠﴾﴾ خوف کے منفی جذبے کو کتنے موثر طریق پر نمایاں کیا گیا ہے۔ اللہ کی عدالت میں کھڑے ہونے کے خوف سے لرزاں و ترساں رہنا ہی انسان کو ہر برائی اور بدی سے روکنے میں نہایت موثر کردار ادا کرتا ہے۔

یہ وہی ''کھڑا ہونا'' ہے جس کی حدیث شریف میں تشریح و تفسیر بایں الفاظ کی گئی ہے:

((لَا تَزُوْلُ قَدَمَا ابْنِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ عِنْدِ رَبِّهٖ حَتّٰى يُسْأَلَ عَنْ خَمْسٍ: عَنْ عُمُرِهٖ فِيْمَا اَفْنَاهُ، وَعَنْ شَبَابِهٖ فِيْمَا اَبْلَاهُ، وَعَنْ مَالِهٖ مِنْ اَيْنَ اكْتَسَبَهٗ وَفِيْمَا اَنْفَقَهٗ، وَمَاذَا عَمِلَ فِيْمَا عَلِمَ)) (رواه الترمذی' عن عبداللّٰه بن مسعود رضی اللہ عنہ)

یعنی آخرت میں کوئی انسان اللہ کی عدالت کے کٹہرے سے ہل نہ سکے گا جب تک کہ اس سے پانچ چیزوں کا حساب نہ لے لیا جائے: (۱) حساب دو کہ عمر کہاں گنوائی؟ ہم نے تم کو ستر' اسّی

(۷۰، ۸۰) برس دیے تھے، وہ کہاں گنوائے؟ (۲) بتاؤ کہ خاص طور پر جوانی کا دور کس حال میں بسر ہوا تھا؟ (۳) یہ بتاؤ کہ مال کہاں سے کمایا تھا، حلال سے یا حرام سے؟ اس کا پورا حساب دو۔ اور (۴) یہ بتاؤ کہ یہ مال خرچ کہاں کیا تھا؟ ادائے حقوق میں یا اللّوں تللّوں میں، اور عیاشی و بدمعاشی میں؟ اس کا بھی پورا حساب دو۔ اور (۵) جو علم تم کو حاصل ہوا تھا اس پر تم نے کتنا عمل کیا تھا؟ اس کا حساب بھی دو۔ ان پانچ باتوں کے حساب کتاب کے بغیر ابن آدم کے قدم عدالت اُخروی سے جنبش نہ کر سکیں گے۔

فکرِ آخرت کے بارے میں ایک دوسری حدیث بھی سن لیجیے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ جَعَلَ الْهُمُوْمَ هَمًّا وَاحِدًا هَمَّ آخِرَتِهٖ كَفَاهُ اللّٰهُ هَمَّ دُنْيَاهُ))

(رواه ابن ماجه، عن عبداللّٰه بن مسعود رضی اللہ عنہ)

''جو اپنے تمام غموں کو ایک غم بنا لے یعنی اپنی آخرت کا غم تو اللہ تعالیٰ اس کے دنیا کے غم کے لیے کافی ہو جائے گا۔''

اب ان دونوں احادیث کی روشنی میں متذکرہ بالا آیات پر پھر غور کیجیے: ﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿۴۰﴾ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿۴۱﴾﴾ ''جو شخص اپنے رب کے حضور میں جواب دہی کے احساس و یقین سے لرزاں و ترساں رہا اور اس نے اپنے نفس کی خواہشات کی باگوں کو کھینچ کر رکھا، پس ایسے شخص کا ٹھکانا یقیناً جنت ہوگا''۔ یہ ہے وہ آخرت کے محاسبے کے خوف کا جذبہ۔ ایک مثبت جذبہ محبتِ الٰہی کا اور دوسرا منفی جذبہ آخرت کے خوف کا۔ تعمیرِ کردار اور سیرت سازی کی یہ دونوں اساسات قرآن نے انسانیت کے لیے فراہم کی ہیں۔ اس کا لُبِّ لُباب اور حاصل کلام یہ ہے کہ اصلاحِ معاشرہ کے لیے اصل اساس ایمان ہے اور اس کی کامیابی کی اصل راہ تجدید ایمان کی سعی و جُہد ہے۔

''ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب!''

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ تجدید ایمان کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟ تو اس وقت موقع نہیں ہے کہ اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کی جائے۔ اس موضوع پر ''مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب'' میں بھی کئی مقامات کے ذیل میں تفصیل سے بحث ہوتی رہی ہے، اجتماعاتِ جمعہ اور دوسرے خطابات میں بھی میں اپنی استعداد کے مطابق گاہ بگاہ اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کرتا رہا ہوں۔ میں اس وقت اختصار کے ساتھ ان باتوں کا اعادہ کروں گا تاکہ بات پوری ہو جائے

اوران کی کسی درجے میں تذکیر بھی۔

ایمان کا منبع اور سرچشمہ قرآن حکیم (۱۰) ہے یا اصحابِ یقین کی صحبت ہے، یعنی ان لوگوں کی صحبت جن کے اذہان وقلوب میں قرآن حکیم اتر چکا ہو۔ علامہ اقبال کے ان اشعار کے مصداق:

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب — گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

جز بہ قرآں ضیغمی روباہی است — فقر قرآن اصل شاہنشاہی است

فقر قرآں؟ اختلاطِ ذکر و فکر — فکر را کامل نہ دیدن جز بہ ذکر

ذکر؟ ذوق و شوق را دادن ادب — کارِ جاں است ایں نہ کارِ کام ولب (۱۱)

یہ اصحاب یقین آسمان سے نہیں اُترتے اور نہ اُتریں گے۔ یہ وجود میں آئے ہیں، اور آئیں گے صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کی نازل کردہ کتابِ مبین یعنی قرآن حکیم سے، اگر قرآن مجید کا اذہان وقلوب میں ''نفوذ'' ہو رہا ہو! میں نے یہاں جان بوجھ کر لفظ 'تعلیم' یا 'نشر واشاعت' کے الفاظ استعمال نہیں کیے۔ ان کی اپنی جگہ بہت بڑی اہمیت ہے۔ لیکن فی الوقت جس چیز کی اصل اہمیت اور ضرورت ہے، وہ ہے قرآن حکیم کے اذہان وقلوب میں 'نفوذ' کی۔ اگر علمِ قرآن اور اشاعتِ قرآن کا سیلاب بھی آیا ہو اور وہ سروں کے اوپر اوپر سے جا رہا ہو تو تعمیرِ سیرت و کردار نہیں ہوگی۔ وہی حقیقت کہ ع ''ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب!'' ضمیر کسے کہتے ہیں؟ باطن میں چھپی ہوئی حقیقت کو۔ اس لفظ کو قلب حساس اور نفس ملامت گر کا ہم معنی اور مترادف سمجھئے — تو جب تک انسان کے باطن میں قرآن حکیم سرایت نہ کرے اور قلب میں اس کا نفوذ نہ ہو، اسلامی تعلیمات کے مطابق کردار سازی ممکن ہی نہیں ہے۔ اس بات کو علامہ اقبال نے اس طرح بھی ادا کیا ہے۔ ؎

---

(۱۰) وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکان فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآن کے سیپاروں میں
(مولانا ظفر علی خان مرحوم)

(۱۱) (اشعار کا ترجمہ) قرآن کے بغیر شیر بھی گیدڑ بن جاتا ہے اور اصل بادشاہی قرآن کے تعلیم کردہ فقر میں ہے۔ جانتے ہو قرآن کا فقر کیا ہے؟ یہ ذکر اور فکر دونوں کے جمع ہونے سے وجود میں آتا ہے اور حقیقت یہی ہے کہ بغیر ذکر کے فکر کامل نہیں ہو سکتا۔ (لیکن یہ بھی جان لو کہ ذکر کی حقیقت کیا ہے) ذکر اصل میں ذوق وشوق کو صحیح راہ پر ڈالنے کا نام ہے۔ یہ محض زبان اور ہونٹوں کا وظیفہ نہیں بلکہ کامل وجود اور پوری ہستی کے ساتھ کرنے کا کام ہے۔ (مرتب)

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود!

یعنی یہ کلامِ الٰہی' یہ قرآن حکیم جب کسی کے باطن میں اُتر جاتا ہے تو اس کے اندر ایک انقلاب آ جاتا ہے اور اس طرح ایک مکمل طور پر تبدیل شدہ شخصیت وجود میں آ جاتی ہے' اور یہی اندر کا انقلاب ہے جو ایک عالمگیر انقلاب کا پیش خیمہ بنتا ہے۔

اگر حکومت فی الواقع اور سنجیدگی کے ساتھ اصلاحِ معاشرہ کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہے تو اس کے لیے دو کام کرنے ضروری ہیں' جو میں آگے بیان کروں گا۔ یہ احتساب' یہ تعزیرات اور یہ قاضی کورٹس' یہ اپنی جگہ کسی حد تک ضروری اور مفید ہیں' میں ان کی نفی نہیں کر رہا۔ ان چیزوں کے بارے میں تو آغاز ہی میں عرض کر چکا ہوں کہ ان کی بھی ضرورت ہے اور یہ درمیانے درجے کی اشیاء ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اصلاحِ معاشرہ کے عمل کا ایک سر ہے اور ایک پیر ہے اور ایک درمیانی دھڑ ہے۔ اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے وہ صرف درمیانی دھڑ کی کچھ باتیں ہیں' نہ سر کی بات ہے نہ پیر کی۔ اس کا سر (چوٹی) یہ ہے کہ معاشرے میں بحیثیت مجموعی ایک عادلانہ و منصفانہ نظام قائم ہو۔ پھر تعمیرِ اخلاق و کردار کے لیے محبتِ الٰہی' محبتِ رسول ﷺ اور محبتِ جہاد فی سبیل اللہ کی متحرک (dynamic) مثبت محبتیں افرادِ قوم میں پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے' اور اس کا پیر (بنیاد) یہ ہے کہ آخرت کے محاسبے اور جواب دہی اور اُخروی سزا کا منفی جذبہ لوگوں کے اذہان و قلوب میں اُتارا جائے اور hammer کیا جائے۔ ٹھیک ہے کہ دنیوی احتساب کا' قانون و تعزیر کا' جیل' کوڑوں اور پھانسی کا بھی خوف اپنی جگہ رہے' اس کی ہرگز نفی نہیں ہے' لیکن اصلاً آخرت کا خوف ہی مؤثر ترین خوف ہے۔ اور یہ مثبت اور منفی جذبات لوگوں کے اذہان و قلوب میں سرایت کرانے کا کوئی معقول و مؤثر سلسلہ ہو تو کامیابی ہوگی۔

اصلاحِ معاشرہ کے لیے دو حکومتی اقدامات کی ضرورت

میں نے عرض کیا تھا کہ اگر اصلاحِ معاشرہ کے لیے حکومت واقعتاً کچھ ٹھوس اور نتیجہ خیز کام کرنا چاہتی ہے تو اس کے لیے دو کام کرنے ضروری ہیں۔ اب میں اس کے بارے میں کچھ عرض کروں گا۔ حکومت کے پاس دو سلسلے ایسے ہیں جن سے یہ کام باحسن وجوہ اور بخوبی سرانجام دیا جا سکتا ہے: پہلا نظامِ تعلیم اور دوسرا ذرائع ابلاغ۔ نظامِ تعلیم کے متعلق یہ بات جان لیجیے کہ جب تک پورے نظامِ تعلیم میں' پرائمری سے لے کر یونیورسٹی کی سطح پر اعلیٰ تعلیم کے نصاب تک' قرآن مجید سمویا ہوا نہیں ہوگا کوئی مفید نتیجہ ہرگز برآمد نہیں ہوگا۔ محض اسلامیات کا

ایک ضمیمہ (Appendix) لگا دینے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس کا تجربہ ہمیں پینتیس (۳۵) سال میں خوب ہو گیا ہے ☆۔ اور ذرائع ابلاغ میں بھی اگر آپ گن کر یہ بتا دیں کہ ہفتے میں ہم نے اتنے گھنٹے مذہبی پروگراموں کے لیے رکھے ہوئے ہیں تو اس سے ہرگز کوئی بات نہیں بنے گی۔ اصلاح کا عمل اُس وقت تک جاری نہیں ہو سکے گا جب تک قرآن حکیم کا حقیقی فہم لوگوں کے باطن میں سرایت کرنے کی صحیح، معقول اور مؤثر منصوبہ بندی نہ کی جائے۔ اگر ذرائع ابلاغ انتشارِ فکری، اباحیت، لذت کوشی اور سرود و تفریح کا باعث بن رہے ہوں اور جملہ پروگراموں میں قوالیوں اور نعتوں کے اوقات جمع کر کے یہ مغالطہ دے دیا جاتا ہو کہ ہمارے ہفتہ وار پروگراموں میں اتنا وقت مذہبی حصے کے لیے مختص ہے، تو اس سے کیا حاصل؟ سوال یہ ہے کہ کثرت سے دکھائے جانے والے فواحش پر مبنی پروگراموں کی موجودگی میں ایسے نام نہاد مذہبی پروگراموں کا معاشرے میں کیا واقعتاً کوئی اثر باقی رہے گا؟ ہر سلیم العقل اس کا جواب نفی میں دینے پر مجبور ہے۔

لہٰذا میں عرض کروں گا کہ اس اعتبار سے جائزہ لیجیے، جانچیے اور پرکھیے، اور دیکھیے کہ کیا حقیقتاً ہمارے ذرائع ابلاغ لوگوں کے اذہان و قلوب میں قرآن حکیم کی انقلابی دعوت، اس کا انقلابی پیغام، اصلاحِ معاشرہ اور تعمیرِ سیرت و کردار کے لیے اس کی عطا کردہ محبت الٰہی، محبت رسول اور محبت جہاد فی سبیل اللہ کی مثبت جذبے کی اساسات اور خوفِ آخرت اور خوفِ محاسبۂ اُخروی کے منفی جذبے کی بنیادیں قائم کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں یا نہیں؟ اگر یہ کام ہو رہا ہے تو ٹھیک ہے..... لیکن میں انتہائی دُکھ اور رنج کے ساتھ عرض کروں گا کہ ان دونوں چیزوں یعنی نظامِ تعلیم اور ذرائع ابلاغ کی Islamization کا معاملہ تا حال نہ صرف مفقود کے درجے میں ہے، بلکہ اخلاق اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے قرآن حکیم کی dynamic اساسات و تعلیمات کو اختیار کرنے کے بجائے یہ دونوں وسائل تخریب کے کام میں مصروف ہیں اور ہماری نوجوان نسل سے لے کر عوام الناس تک سب کو خدانا آشنا تہذیب اور اس کی اقدار، نیز لذت کوشی، دنیا اور مادہ پرستی کی طرف کشاں کشاں لیے جا رہے ہیں، اور ہمارے عوام و خواص میں، اِلا ماشاء اللہ، یہ نظریہ پروان چڑھ رہا ہے اور روز بروز نشو و نما پا رہا ہے کہ: ''بابر بعیش کوش کہ عالَم دوبارہ نیست!'' اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ —— ان شاء اللہ العزیز اس موضوع پر آئندہ جمعہ کو بھی گفتگو جاری رہے گی۔

وما توفیقی الا باللہ

☆ واضح رہے کہ یہ خطاب ۱۹۸۲ء کا ہے، جس پر چھتیس (۳۶) سال مزید گزر چکے ہیں۔

خطاب ②

اصلاحِ معاشرہ کا قرآنی تصوّر

۱۲نومبر۱۹۸۲ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ وادعیہ ماثورہ کے بعد:

اعوذ باللّٰہ من الشَّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قَالَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ فِیۡ سُوۡرَۃِ التَّوۡبَۃِ:

﴿قُلۡ اِنۡ کَانَ اٰبَآؤُکُمۡ وَاَبۡنَآؤُکُمۡ وَاِخۡوَانُکُمۡ وَاَزۡوَاجُکُمۡ وَعَشِیۡرَتُکُمۡ وَاَمۡوَالُ ۨ اقۡتَرَفۡتُمُوۡهَا وَتِجَارَۃٌ تَخۡشَوۡنَ کَسَادَهَا وَمَسٰکِنُ تَرۡضَوۡنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَیۡکُمۡ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوۡلِهٖ وَجِهَادٍ فِیۡ سَبِیۡلِهٖ فَتَرَبَّصُوۡا حَتّٰی یَاۡتِیَ اللّٰہُ بِاَمۡرِهٖ ؕ وَاللّٰہُ لَا یَهۡدِی الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِیۡنَ ﴿۲۴﴾﴾

وَقَالَ اللّٰہُ سُبۡحَانَهٗ وَتَعَالٰی فِیۡ سُوۡرَۃِ الۡعَلَقِ:

﴿کَلَّاۤ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَیَطۡغٰۤی ﴿۶﴾ اَنۡ رَّاٰهُ اسۡتَغۡنٰی ﴿۱۰﴾ اِنَّ اِلٰی رَبِّکَ الرُّجۡعٰی ﴿۷﴾﴾

صَدَقَ اللّٰہُ مَوۡلَانَا الۡعَظِیۡمُ

حضرات! گزشتہ جمعہ میری تقریر کا موضوع تھا: ''اصلاحِ معاشرہ کا قرآنی تصور'' اور آج بھی مجھے اسی موضوع پر اظہارِ خیال کرنا ہے۔ گویا میری آج کی گفتگو پچھلے جمعہ کی تقریر کا تسلسل ہے اور پھر اسی موضوع کی آخری کڑی ان شاء اللہ میری وہ تقریر ہوگی جو مجھے آج رات مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی دس سالہ تقریب کے ضمن میں جناح (ٹاؤن) ہال میں افتتاحی اجلاس میں کرنی ہے۔

اصلاحِ معاشرہ کی تین سطحیں

آگے بڑھنے سے پہلے گزشتہ جمعہ کی گفتگو کا خلاصہ اپنے ذہن میں تازہ کر لیجئے تاکہ اگلی بات سمجھنا آسان ہو جائے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اصلاحِ معاشرہ کی کوششوں کی تین سطحیں

ہیں، جن میں سے پہلی کو ہم اس کی جڑ، بنیاد یا اساس قرار دے سکتے ہیں اور اس کے لیے میں نے ''پیر'' کا لفظ استعمال کیا تھا۔ دوسری سطح درمیانی درجہ سے متعلق ہے، گویا وہ اس کا ''دھڑ'' ہے۔ تیسری سطح کو اس کا ذروۃ السنام یعنی چوٹی قرار دیا جا سکتا ہے، جسے میں نے اس کے ''سر'' سے تعبیر کیا تھا۔ پھر میں نے تجزیہ کر کے واضح کیا تھا کہ اس وقت اصلاحِ معاشرہ کے حوالے سے حکومتی سطح پر جو تھوڑی بہت کوششیں ہو رہی ہیں ـــــ جن کا اخبارات اور ذرائع ابلاغ میں خوب چرچا ہو رہا ہے ـــــ اُن میں نہ ہی اس کا پیر سامنے ہے اور نہ ہی اس کا سر، صرف درمیانی درجے پر نیم دلانہ قسم کی کچھ توجہات مرتکز ہیں اور وہ بھی میرے نزدیک محض نمائشی نوعیت کی ہیں۔ البتہ ذرائع ابلاغ کے ذریعے سے ان کوششوں کا بہت چرچا کیا جا رہا ہے اور اس سے مقصود لوگوں کو اطمینان دلانا ہے کہ اس ضمن میں حکومتی سطح پر کچھ نہ کچھ کام ہو رہا ہے۔

اصلاحِ معاشرہ کی جڑ اور بنیاد یہ ہے کہ انسان کی سیرت و کردار کی مثبت تعمیر کا اہتمام ہو، اس لیے کہ معاشرہ افراد پر مشتمل ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر انفرادی سیرت سازی اور تعمیرِ کردار کا مثبت پروگرام اصلاحِ معاشرہ کی تحریک میں شامل نہ ہو تو ظاہر بات ہے کہ اس تحریک کی کامیابی ممکن نہیں ہے۔ یہی اس کی جڑ، بنیاد، اساس ہے اور یہی اس کا پیر ہے۔

اصلاحِ معاشرہ کی چوٹی یہ ہے کہ اگر انسان کے اردگرد کے ماحول میں ایک منصفانہ اور مبنی بر عدل و قسط نظام قائم نہیں ہے تو اس سے بھی انسان میں مثبت تعمیری احساسات و جذبات پیدا نہیں ہوں گے، بلکہ ظلم و عدوان اور استحصالی و استبدادی نظام کے فطری تقاضے کے نتیجے میں نفرت و کدورت، عداوت اور انتقام کے جذبات پیدا ہوں گے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ جیسے کوئی پودا زمین سے نکلتا ہے تو اس کی ایک جڑ ہوتی ہے لیکن اگر اس پودے کو نشوونما کے لیے سازگار فضا اور ماحول میسّر نہ ہو تو وہ پودا پروان نہیں چڑھے گا۔ گویا جڑ اور زمین تو ہے انفرادی سیرت و کردار کی تعمیر اور ماحول درحقیقت وہ نظام ہے جس میں انسان سانس لے رہا ہوتا ہے اور جس میں لوگوں سے اس کے روابط ہوتے ہیں۔ اگر وہ نظام ظالمانہ و جابرانہ ہے، استحصالی و استبدادی ہے، اس میں جبر، ناروا امتیازات اور فرق و تفاوت (discrimination) ہے تو ظاہر بات ہے کہ اس کا ردِّعمل انسان کے افکار و اعمال پر پڑنا لازمی ہے، جس سے انسان میں تعمیری احساسات و جذبات کے بجائے تخریبی احساسات و جذبات وجود میں آئیں گے اور محبت و اخوت کے بجائے نفرت اور انتقام کے جذبات پروان چڑھیں گے۔

اصلاحِ معاشرہ کے سر اور پیر کے درمیان ایک اور شے بھی ہے اور وہ ہے: اوامر و نواہی کا نظام اور احتساب اور تعزیر و تادیب کا ایک قانونی نظام۔ یہ بھی درحقیقت اصلاحِ معاشرہ کے لیے مدد و معاون ہوتا ہے' لیکن یہ جڑ اور چوٹی کے بین بین شے ہے۔ اس ضمن میں یہ یاد رہے کہ اگر اصلاحِ معاشرہ کی نہ تو جڑ موجود ہو یعنی انفرادی سیرت سازی اور تعمیرِ کردار مفقود ہو اور پھر اس کی چوٹی بھی موجود نہ ہو یعنی کوئی منصفانہ نظام بھی موجود نہ ہو' تو پھر محض تعزیری و احتسابی نظام سے مطلوبہ نتائج نہیں نکلیں گے اور اس میں اصلاح کی مساعی بھی ناکام رہے گی۔

جذبے اور ارادے کی اہمیت

تعمیرِ کردار اور سیرت سازی کے لیے اصل اہمیت انسان کے فکر کی نہیں' بلکہ اس کے جذبے اور ارادے کی ہے۔ یقیناً فکر اگر اپنی جگہ صحیح نہیں ہے تو عمل کے غلط رُخ اختیار کرنے کی ایک بنیاد پڑے گی' لیکن انسان نیکی و بدی اور اچھائی و برائی کے معاملہ میں کسی مغالطہ میں مبتلا نہیں ہوتا۔ تمیز و امتیاز کی یہ صلاحیت و اہلیت اللہ تعالیٰ نے انسان کو الہامی و وجدانی طور پر عطا کی ہے۔ اس بارے میں قرآن حکیم کی شہادت موجود ہے:

﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝۷ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝۸﴾ (الشمس)

''اور قسم ہے نفس انسانی کی اور اُس ذات کی جس نے اُسے سنوارا' پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اس پر الہام کر دی۔''

گویا فطرتِ انسانی خوب آگاہ ہے کہ خیر کیا ہے' شر کیا ہے' نیکی کیا ہے' بدی کیا ہے' فجور کیا ہے اور تقویٰ کیا ہے' جبکہ اصل روگ اور مرض مرزا غالبؔ کے اس شعر میں موجود ہے کہ ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی!

گویا طبیعت کو راغب کرنا ہی اصل شے ہے۔ یعنی انسان کے اندر یہ جذبہ اور ارادہ اُبھرے کہ وہ بدی کے خلاف مدافعت و مقاومت (resist) کر سکے۔ خواہ اُسے اس میں فوری طور پر کوئی منفعت حاصل ہو رہی ہو یا کوئی لذت محسوس ہو رہی ہو' لیکن جب اس کا ضمیر کہے کہ یہ شے یا یہ کام فی نفسہٖ برا ہے تو اس کی قوتِ ارادی اتنی مضبوط ہونی چاہیے کہ وہ فوری منفعت یا فوری لذت سے کنارا کش اور دستبردار ہو سکے۔ اسی طرح جب اس کے اندر سے یہ آواز آ رہی ہو کہ یہ کام یا یہ چیز خیر ہے' نیکی ہے تو اس کو اختیار کرنے کے لیے اس کے اندر اتنی مضبوط قوتِ ارادی

موجود ہو کہ وہ اسے بہر طور اختیار کر لے' خواہ اس کام میں بظاہر نقصان ہو رہا ہو' اس سے کوئی تکلیف آ رہی ہو یا اس سے اس کا کوئی دوست یا عزیز ناراض ہو رہا ہو۔ جیسے قرآن حکیم میں فرمایا:

﴿وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ﴾ (النساء:۱۳۵)

''(عدل وقسط کی بات کہو) چاہے وہ تمہارے اپنے خلاف ہو یا تمہارے والدین اور اعزّہ واقارب کے خلاف۔''

تعمیرِ خودی اور جذبۂ محبت

اب غور کیجئے کہ وہ کون سی چیز ہے جو انسان کو ان تمام چیزوں کو انگیز کرنے پر آمادہ کر سکتی ہے؟ ظاہر بات ہے کہ وہ چیز اندر کی ایک مضبوط قوتِ ارادی (will power) ہے۔ اگر یہ موجود ہے تو انسان کھڑا رہے گا اور نیکی کی راہ پر گامزن ہوگا' ورنہ وہ اس نیکی کی راہ سے پھسل جائے گا اور بدی کے راستے پر چل پڑے گا۔ اس قوتِ ارادی کی تعمیر ہی درحقیقت (علامہ اقبال کے الفاظ میں) ''تعمیرِ خودی'' ہے' اور تعمیرِ خودی' جو تعمیرِ سیرت و کردار کی اصل بنیاد ہے' کا تعلق جذبات سے ہے۔ پھر بنیادی طور پر انسان کے جذبات دو قسم کے ہیں: ایک ہے جذبۂ محبت اور دوسرا ہے جذبۂ خوف۔ محبت کا جذبہ مثبت اور خوف کا جذبہ ایک منفی جذبہ ہے۔ ان دونوں جذبات ہی کی بنیاد پر انسان کے اندر تعمیرِ کردار اور سیرت سازی کا عمل شروع ہو سکتا ہے۔

پچھلے جمعہ میں نے عرض کیا تھا کہ دنیا کے دوسرے نظاموں میں اس محبت کو وابستہ کیا جاتا ہے کہیں وطن سے' کہیں قوم سے' کہیں کسی شخصیت سے' کہیں اپنی نسل اور زبان سے اور کہیں کسی نظریہ (ideology) سے۔ ان میں سے کسی ایک چیز کی بھی محبت انسان کے دل میں گھر کر جائے تو گویا انسان کو سیرت و کردار کو سنوارنے' اس کا تسویہ کرنے' اس کی قوتِ ارادی کو مضبوط کرنے یعنی اس کی ''خودی'' کی تعمیر کے لیے جڑ اور بنیاد فراہم ہو گئی اور اس کو وہ مضبوط بنیاد (rock foundation) مل گئی جس پر اس کی سیرت سازی ہو سکے گی۔ اس لیے کہ اگر انسان کے دل میں ان میں سے کسی چیز کی محبت جاگزیں ہے تو وہ خود غرضی کی سطح سے بلند ہو سکے گا۔

البتہ یہ ظاہر ہے کہ ان محبتوں کی بنیاد پر جو کردار وجود میں آئے گا' وہ قوم اور وطن پرستانہ کردار ہوگا اور اس میں وسعت اور بلند نظری نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ اس میں بھلائی ہو گی صرف اپنے وطن اور اپنی قوم کے لیے' اور بھلائی اور بُرائی کے معیارات کے متعلق ایسا شخص یہ

سوچے گا کہ جو کچھ میری قوم اور میرے وطن کے لیے بہتر ہے' یہی درحقیقت بھلائی اور خیر ہے اور جو میرے وطن یا قوم کے لیے برا ہے وہی دراصل برائی اور خرابی ہے' خواہ اپنی حقیقی قدر و قیمت کے اعتبار سے معاملہ اس کے برعکس ہو۔ ایسا شخص اپنی قوم کو دھوکہ نہیں دے گا' دوسروں کو دھوکہ دے گا۔ اپنی قوم کے ساتھ غداری نہیں کرے گا لیکن دوسروں کے ساتھ بے وفائی کرے گا۔ معلوم ہوا کہ اس سیرت و کردار کی افادیت محدود ہے' لیکن بہرحال کچھ نہ کچھ تو بھلائی موجود ہے کہ اپنے وطن اور اپنی قوم کی محبت ہے اور ان کے لیے ایثار و قربانی کا جذبہ موجود ہے۔ اس ضمن میں' میں نے پچھلے جمعہ میں نبی اکرم ﷺ کے ایک ابتدائی دعوتی خطبے کے تمہیدی الفاظ آپ کو سنائے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ الرَّائِدَ لَا یَکْذِبُ اَھْلَہٗ، وَاللّٰہِ لَوْ کَذَبْتُ النَّاسَ جَمِیْعًا مَا کَذَبْتُکُمْ، وَلَوْ غَرَرْتُ النَّاسَ جَمِیْعًا مَا غَرَرْتُکُمْ، وَاللّٰہِ الَّذِیْ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اِنِّیْ لَرَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ خَاصَّۃً وَّ اِلَی النَّاسِ کَافَّۃً))

''(لوگو!) تم جانتے ہو کہ رائد (قافلے کا رہنما) اپنے قافلے والوں سے کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ اللہ کی قسم! اگر (بفرضِ محال) میں تمام انسانوں سے جھوٹ کہہ سکتا تب بھی تم سے کبھی جھوٹ نہ بولتا اور اگر (بفرضِ محال) میں تمام انسانوں کو دھوکہ اور فریب دے سکتا تب بھی تمہیں کبھی نہ دیتا۔ اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں! میں اللہ کا رسول ہوں' تمہاری طرف خصوصاً اور پوری نوعِ انسانی کی طرف عموماً!''

نبی اکرم ﷺ نے یہ اسلوبِ خطاب اس لیے اختیار فرمایا کہ قریش اچھی طرح جانتے تھے کہ جھوٹ کبھی آنحضور ﷺ کے پاس بھی نہیں پھٹکا تھا' اسی لیے اس معاشرے نے نبوت سے قبل آپؐ کو ''الصادق اور الامین'' کے خطابات دیے تھے۔ دراصل یہ تعبیر ہے اس بات کی کہ اگر دل میں قوم اور وطن کے لیے اخلاص و خلوص کے ساتھ محبت ہے تو ایک بہتر کردار وجود میں آتا ہے۔

پاکستانی عوام' وطن اور قوم کی محبت سے بھی عاری ہیں

پاکستان میں رہنے والے مسلمانوں کا اصل المیہ یہ ہے کہ ان کے پاس یہ بنیاد بھی نہیں ہے۔ خدا پرستی اور محبتِ الٰہی تو نہایت اعلیٰ و ارفع شے ہے' لیکن وطن' قوم پرستی اور اس طرح کے چھوٹے چھوٹے سہارے جو سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے دوسروں نے فراہم کیے ہوئے ہیں' وہ بھی دنیوی نقطۂ نظر سے مفید ہوتے ہیں اور قومیں ان سہاروں کے بل پر کھڑی ہوتی

ہیں۔اگرچہ قرآن مجید کی رُو سے ایسی تمام چیزوں کا معاملہ یہی ہے کہ:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۶۵)

''اور لوگوں میں ایسے بھی لوگ ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا ہمسر اور مدمقابل بناتے ہیں اور ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی اللہ کے ساتھ ہونی چاہیے۔ حالانکہ ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں۔''

لیکن ہمارا معاملہ یہ ہے کہ فی الوقت ہماری عظیم اکثریت نہ اللہ سے محبت کرتی ہے اور نہ اُس کے رسول ﷺ سے۔ اس نمائشی محبت کو بھول جایئے' جس کا اظہار میلاد کی محفلوں' نعتوں' نعروں اور جلوسوں وغیرہ کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ یہ محبت نہیں بلکہ اصل محبت کو دل سے محو کرنے کے لیے شیطان کا ایجاد کردہ طلسم ہوش ربا ہے۔

مزید برآں ہماری عظیم ترین اکثریت نہ اپنے وطن سے محبت کرتی ہے اور نہ اپنی قوم سے۔ اس معاملے میں ہم نوسو ننانوے فی ہزار کے تناسب سے تہی دست ہیں۔ نتیجتاً اس وقت ہمارے ہاں فی الواقع جو صورتِ حال موجود ہے' وہ اظہر من الشمس ہے' لہٰذا اس کو تفصیل سے بیان کرنے کی میں حاجت محسوس نہیں کرتا۔ ہم میں سے ہر باشعور اور حساس دل رکھنے والا اچھی طرح جانتا ہے کہ دینی و اخلاقی اور قومی و ملکی اعتبار سے ہمارے موجودہ معاشرے کی حالت کیا ہے۔ صورتِ واقعہ اتنی المناک ہے کہ بیان کرتے ہوئے کلیجہ شق ہوتا ہے۔

ہماری عظیم اکثریت کا حال یہ ہے کہ خود غرضی' خود لذتی اور عیش کوشی کے سوا ان کے ذہن و فکر اور ان کے مقاصد کی کوئی بلند تر سطح موجود ہی نہیں ہے۔ اپنی ذات' اپنے مفاد اور اپنی اغراض سے بلند تر ہو کر سوچنے والے ہمارے معاشرے میں نمک کے تناسب سے اگر موجود ہوں تو ہوں' ورنہ صورتِ واقعہ یہی ہے کہ ہماری عظیم ترین اکثریت نے ان تمام خوبیوں سے تہی دست و تہی دامن ہو کر صرف اپنی ذات اور اپنے مفاد کے لیے اپنی تمام توانائیوں' قوتوں اور صلاحیتوں کو لگا رکھا ہے۔ ان کی اپنی ذات ہی ان کا اصل کعبہ اور مقصود و مطلوب ہے اور وہ اپنے اسی حریم ذات کے گرد طواف کر رہے ہیں۔

انسانیت اور نظریے کی محبت

میں نے گزشتہ جمعہ دوسری بات یہ عرض کی تھی کہ قوم و وطن کی سطح سے ایک بلند اور بالاتر

محبت ''انسان کی محبت'' بھی ہے اور پھر اس حُبِ انسانیت میں دنیا میں ایک عادلانہ و منصفانہ نظام قائم کرنے اور استحصالی و استبدادی نظام کو ختم کرنے کے لیے کسی نظریے کی محبت کا بھی یقیناً دنیا میں وجود ہے۔ اگر فاطر فطرت کا دیا ہوا مبنی بر قسط و عدل نظام ان کے ذہن کی گرفت میں نہیں آیا یا پہنچانے والوں نے نہیں پہنچایا تو انہوں نے اپنے ذہن سے انسان کی بحیثیت مجموعی بھلائی اور خیر کے لیے سوچا ہے۔ اسی کو انہوں نے اپنے نظریے بلکہ صحیح تر الفاظ میں اپنے عقیدے اور ایمان کی حیثیت سے قبول کر کے اپنے نظریے کے مطابق ایک نظام کے لیے قربانیاں دی ہیں۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں سب سے پہلا انقلاب ''بالشویک انقلاب'' آج سے تقریباً ساٹھ برس قبل روس میں آیا جس کے متعلق یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ یہ انقلاب تو انقلابوں کی ماں ثابت ہوا اور اس کے بطن سے نہ معلوم کتنے ممالک میں اسی نظریے کے مطابق انقلابات آ چکے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ ان انقلابات کو لانے کے لیے لوگوں نے قربانیاں دی ہیں' اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا ہے' اپنے کیریئر تباہ کرائے ہیں۔ لاکھوں انسانوں کی ہڈیوں کا چورا ان انقلابات کی بنیادوں میں پڑا ہے تو جب کہیں یہ کامیاب انقلابات وقوع پذیر ہوئے ہیں۔ انقلابات آپ سے آپ اور خود بخود تو نہیں آیا کرتے۔ زارِ روس جیسے مستبد حکمران' جن کا طوطی بول رہا تھا' ایسے جباروں کا تختہ پلٹ دینا کوئی آسان بات تو نہیں تھی۔ اس تمام ایثار و قربانی کی تہ میں اُسی نظریے کی محبت کارفرما تھی۔

اِک تصوّر کے حسنِ مبہم پر
پوری ہستی مٹائی جاتی ہے

جب آپ اس نظریے کا تجزیہ کریں گے تو آپ اس نتیجے تک لازماً پہنچیں گے کہ اس کا اصل محرک انسان دوستی یا حُبِ انسانیت ہے۔ دنیا سے ظلم' استبداد اور استحصال کے خاتمے میں ہی انسان کے لیے مستقل خیر اور بھلائی ہے' یہ جذبہ انسانی فکر سے ماخوذ ہے اور اس نظریے کے لیے قربانی کا جذبہ رکھنے والے اور فعال و پر جوش لوگوں کے اذہان و قلوب کو مسخر کرتا ہے۔ چنانچہ واضح ہو گیا کہ حُبِ انسانیت بھی ایک نہایت پُر قوت اور مثبت جذبہ محرکہ ہے اور یہی جذبہ اشتراکیت کے نظریے کی تہ میں مستور ہے۔

اسلام میں انسانی جذبات کی ارفع ترین سطح

میں عرض کر چکا ہوں کہ بنیادی طور پر انسانی جذبات کی دو قسمیں ہیں: جذبۂ محبت اور

جذبہ خوف اور اسلام یہ دونوں جذبے دیتا ہے اور اس بلند' ارفع اور اعلیٰ ترین سطح پر دیتا ہے کہ جس سے بالاتر سطح کا تصور ممکن ہی نہیں ہے۔ محبت کی بلند ترین سطح اللہ کی محبت اور اس کے ساتھ بالکل ملحق (bracketed) محبت ہے جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی محبت۔ یہ ہے وہ محبت جس کو اسلام ایک بندۂ مؤمن کے ذہن وقلب میں بطور احساس و بنیاد قائم کرتا ہے۔ یہ محبت مضبوط ترین بنیاد (rock foundation) ہے جس پر ایک حقیقی بندۂ مسلم کی سیرت وکردار کی تعمیر ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی جہاد فی سبیل اللہ کی dynamic محبت کہ اللہ کے دین کو قائم کرنے کے لیے ہر ممکن جدوجہد' کوشش ومحنت اور کشمکش کرنا اور نظامِ عدل وقسط قائم و نافذ کرنے کے لیے اپنی توانائیاں' قوتیں اور صلاحیتیں لگانا۔ وہ نظام جو جناب محمد ﷺ دے کر بھیجے گئے اور جس کے بارے میں قرآن مجید میں تین بار فرمایا گیا: ﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ اور جس کے متعلق سورۃ الشوریٰ میں نبی اکرم ﷺ سے کہلوایا گیا: ﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَكُمْ ؕ﴾ (آیت ۱۵) ''(لوگو! جان لو کہ میں صرف واعظ بن کر نہیں آیا بلکہ) مجھے حکم ہوا ہے کہ میں تمہارے مابین عدل کا نظام قائم کروں''۔ مزید یہ کہ اس دنیا میں انبیاء ورسل علیہم السلام کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک اہم ترین غایت یہ بھی ہے کہ وہ نظامِ عدل وقسط بالفعل قائم ونافذ ہو جو اللہ فاطر السماوات والارض اور فاطر انسان کی طرف سے ان کو دیا گیا ہے:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ﴾ (الحدید: ۲۵)

''بلاشبہ اور بالتحقیق ہم نے اپنے رسولوں کو کھلی اور واضح نشانیوں (معجزات) کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزانِ شریعت (نظامِ زندگی) نازل کی تاکہ لوگ عدل پر قائم ہوں۔''

عدل وانصاف کے بہت سے نظام انسان کے فکر اور غور وتدبر سے وجود میں آئے ہیں۔ ایک قسط وعدل پر مبنی اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا نظامِ حیات ہے اور اس کی تکمیل اور اِتمام ہوا ہے جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر۔ پھر نبی اکرم ﷺ نے اس نظامِ عدل وقسط کو صرف نظری طور پر پیش نہیں فرمایا بلکہ اس کو بالفعل قائم ونافذ کر کے دکھایا اور اس کی برکات وحسنات کا تجربہ نوعِ انسانی کو کرادیا۔ اسی نظام کے احیاء وتجدید کے لیے ایثار' اس کے قیام کے لیے محنت وکوشش اور قربانی

یہ وہ دوسرا مثبت جذبہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہلِ ایمان کو عطا کیا گیا ہے۔ ان دونوں جذبوں کو سورۃ التوبہ کی آیت ۲۴ میں بڑی عمدگی سے بیان کیا گیا ہے جس کی تلاوت میں نے خطاب کے آغاز میں کی تھی:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۴﴾﴾

''(اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دیجیے کہ اگر تمہارے باپ' تمہارے بیٹے' تمہارے بھائی' تمہاری بیویاں (اور بیویوں کے لیے شوہر)' تمہارے رشتہ دار اور وہ مال جو تم نے بہت محنت سے کمائے ہیں' اور وہ تجارت جس کے مندے کا تمہیں خطرہ رہتا ہے' اور وہ مکانات جو تمہیں بہت پسند ہیں' (اگر یہ سب چیزیں) تمہیں محبوب تر ہیں اللہ' اُس کے رسول اور اُس کے رستے میں جہاد سے' تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ سنا دے۔ اور اللہ ایسے فاسقوں کو راہ یاب نہیں کرتا۔''

معلوم ہوا کہ محبت اللہ کی اور محبت اس کے رسول ﷺ کی اور پھر محبت اللہ کے راہ میں جہاد کی' اگر یہ تین محبتیں موجود ہیں تو گویا ایک بندۂ مؤمن کی سیرت سازی اور تعمیرِ کردار کی مثبت اساس موجود ہے اور اگر یہ تین محبتیں موجود ہی نہیں ہیں تو وہ جڑ اور بنیاد ہی سِرے سے موجود نہیں ہے جس پر ایک مسلمان کی سیرت و کردار کی تعمیر منحصر ہے۔ ایسے لوگ بلا شک وشبہ سب سے زیادہ گھاٹے اور خسارے میں ہیں۔ یہ نہ دنیا کے رہیں گے اور نہ دین کے۔ نہ ان کو ان تین محبتوں کی جڑ بنیاد ملی اور نہ ہی وطن پرستی' قوم پرستی' نسل و زبان پرستی اور کسی آئیڈیالوجی کی محبت کی اساس انہیں میسر آئی۔ چنانچہ ایسے لوگ بالکل تہی دامن ہیں' نہ اِدھر کے ہیں اور نہ اُدھر کے' بفحوائے آیت قرآنی: ﴿مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۫ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ؕ﴾ (النساء:۱۴۳) ''یہ اس کے مابین مذبذب (ہو کر رہ گئے) ہیں۔ نہ تو یہ اِن کی جانب ہیں اور نہ ہی اُن کی جانب ہیں''۔ گویا یہ لوگ ہوا میں معلّق ہیں' بے لنگر کا جہاز ہیں یا ریت کے گھروندے ہیں' جن کی کوئی بنیاد ہی نہیں ہوتی۔ جن لوگوں نے انسانی فکر کی مہیا کردہ اساس کو اپنا لیا ہے کم از کم ان کی دنیا تو بن جائے گی اور وہ دنیا میں سربلند نظر آئیں گے۔ لیکن جن کے پاس یہ بھی نہیں ہے' جیسا کہ فی الوقت ہمارا حال ہے تو ایسے لوگوں کے لیے تو ذلت و رسوائی ہے

اوران کے لیے عزت و وقار جیسی اقدار کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ ان کا حال تو قرآن مجید کے فتویٰ کے مطابق یہ ہے کہ: ﴿خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ﴾ یعنی دنیا بھی گئی اور آخرت میں بھی کچھ نہیں ملے گا۔

خوف و انذار مؤثر ترین جذبہ ہے!

تعمیرِ سیرت و کردار کی مثبت اساس ''محبت کا جذبہ'' ہے اور اس کے لیے منفی اساس ''خوف کا جذبہ'' ہے۔ یہ جذبہ ضروری بلکہ بہت ضروری ہے' اس لیے کہ محبت کے شناسا اور رمز آشنا ہمیشہ کم ہی ہوتے ہیں۔ یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ ''ذوقِ نغمہ'' بہت کم لوگوں میں ہوتا ہے' جبکہ اس کے مقابلے میں ''نوائے تلخ'' کو سمجھنے والے لوگ ہمیشہ عظیم اکثریت میں ہوتے ہیں: ع ''نوارا تلخ تر می زن' چو ذوقِ نغمہ کمیابی'' ......اور ؎

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر   مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر!

پس معلوم ہوا کہ خوف کے جذبے کی بھی شدید ضرورت ہے۔ دنیا نے اس خوف کے جذبے کو برقرار رکھنے کے لیے پولیس' جیل' سزا' پھانسی اور اسی نوع کی تعزیر و تادیب کے نظام کو اختیار کیا ہے جو ہم سب کے سامنے ہے۔

اسلام نے بھی جذبۂ خوف کو بھرپور طریقے سے دو سطح پر استعمال (employ) کیا ہے: ایک دنیا میں تعزیرات و حدود کی شکل میں اور دوسرا آخرت کے محاسبے کی صورت میں۔ دنیا میں اُس نے اس خوف کے جذبے کو بڑے شدومد کے ساتھ استعمال کیا ہے اور اس میں معاشرے کے لیے عبرت پذیری و سبق آموزی کا پورا اہتمام کیا ہے۔ چونکہ اسلام کے نظامِ حدود و تعزیرات کی اصل حکمتیں اور مصلحتیں دنیا کے سامنے نہیں ہیں' لہٰذا دنیا والے ان کو وحشیانہ سزائیں کہتے اور سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ان شدید اسلامی سزاؤں کی حکمت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ایک کو سزا ملے اور معاشرے کی عظیم اکثریت کے ہوش ٹھکانے آ جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی ایک حد بھی صحیح طور پر جاری (exercise) ہو جائے تو اس کی برکات کے متعلق نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشادِ مبارک ملاحظہ کیجیے:

((اِقَامَةُ حَدٍّ مِنْ حُدُوْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ مِنْ مَطَرِ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً فِيْ بَلَادِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ))[1]

---

(۱) صحیح ابن ماجه للالبانی' ج:۲۰۷۲۔ صحیح الجامع' ح:۱۱۳۹۔ الترغیب والترهیب للمنذری: ۲۴۴/۳۔

یعنی اگر اللہ کی مقرر کردہ حدود میں سے ایک حد بھی جاری اور نافذ کر دی جائے تو اس ملک میں اتنی برکات کا ظہور ہوگا جتنی چالیس روز کی بارش سے برکات ہوتی ہیں۔ آپ اگر اپنے ملک کے لحاظ سے چالیس روز کی بارش کا تصور کریں گے تو یہاں سیلاب آ جائے گا' لیکن نبی اکرم ﷺ کی دعوت کے ابتدائی مخاطبین کے بے آب و گیا اور لق و دق صحرا کے ملک کا تصور کیجئے۔ وہاں اگر چالیس روز بارش ہو جائے تو وہاں جو ہریالی اور رونق ہو جائے گی' اس کو آنحضور ﷺ نے اصل میں تشبیہ کے طور پر استعمال فرمایا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے اس ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ ایسے کسی ملک میں جیسا کہ عرب ہے' چالیس شبانہ روز بارش سے جو برکات ظاہر ہوں گی اور زمین اپنے خزانے اُگلے گی' اس سے کہیں زیادہ برکات کا ظہور وہاں ہوتا ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود میں سے کسی ایک حد کو نافذ کر دیا جائے۔

ہمارے حدود آرڈیننس کی کہانی

ہمارے ہاں حدود آرڈیننس کا چرچا کئی سال سے ہو رہا ہے لیکن نہ معلوم کیا وجہ ہے کہ آج تک ایک حد بھی جاری نہیں ہوئی۔ اخبارات کے ذریعے یہ ضرور معلوم ہوتا رہتا ہے کہ فلاں کو اتنے کوڑے لگ گئے۔ یہ کوڑے تو سیاسی اور تخریبی نوعیت کے جرائم پر بھی لگ جاتے ہیں اور زنا' اغواء وغیرہ کے جرائم پر بھی۔ لیکن حدود اللہ میں سے اپنے جملہ لوازم کے ساتھ تا حال کوئی ایک حد بھی جاری نہیں ہو رہی۔ کیا چوریاں نہیں ہو رہیں؟ بلکہ چار پانچ سال میں مسلح اور منظم ڈکیتیوں کی وارداتیں تو بے حد و حساب ہوئی ہیں۔ شاید پچھلے تیس سال میں اس نوع کی جتنی وارداتیں مجموعی طور پر ہوئی ہوں گی' گمان ہے کہ آخری پانچ سال میں ہونے والی وارداتوں کی تعداد مقابلتاً زیادہ ہی ہوگی۔ جبکہ ملک میں مارشل لاء نافذ ہے اور حدود آرڈیننس کے اعلان پر ڈھائی سال کے لگ بھگ گزر چکے ہیں ☆۔ کیا اس عرصے میں قطع ید کی حد کہیں ایک جگہ اور صرف ایک مرتبہ بھی کہیں جاری ہوئی؟ چوری کی حد قطع ید کا بیان سورۃ المائدۃ میں آیا ہے:

﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۳۸﴾

''اور چور' خواہ عورت ہو یا مرد' دونوں کے ہاتھ کاٹ دو۔ یہ ان کی کمائی کا بدلہ ہے اور اللہ کی طرف سے عبرتناک سزا۔ اللہ کی قدرت سب پر غالب ہے اور وہ دانا و بینا ہے۔''

☆ یاد رہے کہ یہ خطاب نومبر ۱۹۸۲ء کا ہے' جب ملک میں جنرل ضیاء الحق کا مارشل لاء نافذ تھا۔

پھر ڈاکے اور ڈکیتیوں کی سزا بطور حد سورۃ المائدۃ کی آیت ۳۳ میں آئی ہے:

﴿اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْھِمْ وَاَرْجُلُھُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ﴾

''جو لوگ اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لیے تگ و دو کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کیے جائیں یا سولی چڑھائے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں یا وہ جلاوطن کر دیے جائیں۔''

ان میں سے کوئی ایک حد بھی آج تک کہیں نافذ نہیں ہوئی۔ اگر یہ حدود فی الواقع نافذ ہو جاتیں تو کیا وہ عناصر' جو فلموں اور ٹی وی کے ذریعے (حکومتی سرپرستی میں) منظم ڈاکوؤں کی تربیت (training) کر رہے ہیں' ان کے ہوش ٹھکانے نہ آ جاتے! اسی طرح اگر کہیں غیر شادی شدہ زانی پر سو کوڑوں اور شادی شدہ زانی پر رجم کی حد ایک مرتبہ بھی برسرِ عام نافذ ہو جاتی تو پورے معاشرے پر جو لرزہ طاری ہوتا' اس کا آپ خود تصور کر سکتے ہیں۔

حدود آرڈیننس اپنی جگہ صحیح سمت میں اقدام تھا' لیکن اگر یہ آرڈیننس بالفعل نافذ نہیں ہے تو بتائیے کہ اس کا آخر معاشرے کو فائدہ کیا حاصل ہوا؟ میری اس بات کا مطلب یہ ہے کہ اس آرڈیننس میں جو خامیاں رہ گئی ہیں' ان کو شرعی عدالت کے توسط سے دور کر کے اس کو فی الفور نافذ ہونا چاہیے ☆۔ صرف اس کا چرچا کرنا' اخبارات کی سرخیوں کی زینت بنانا یا ذرائع ابلاغ کے ذریعے اس کا پروپیگنڈا کرنا' کوئی معنی نہیں رکھتا' بلکہ اُلٹا اس کا نقصان ہو رہا ہے' جیسے ایک حکومتی عہدے دار کا فرمانا ہے کہ حدود آرڈیننس کی وجہ سے اب تک پولیس کے وارے نیارے ہوئے ہیں' اس لیے کہ رشوت کا تناسب بڑھ گیا ہے۔ اب پولیس کو کامل اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو مجرموں کو رائج شدہ تعزیراتِ پاکستان کے تحت عدالتوں میں پیش کرے اور چاہے تو حدود آرڈیننس کے تحت۔ پس اس حدود آرڈیننس کا اگر کوئی فائدہ ہوا ہے تو وہ صرف پولیس کو حاصل ہوا ہے' لیکن اس حدود آرڈیننس کی کوئی معمولی سی معمولی برکت بھی تا حال ہمارے ماحول اور ہمارے معاشرے میں کہیں محسوس و مشہور نظر نہیں آتی اور نہ اس کا کوئی تجربہ ہمارے سامنے اب تک آیا ہے۔

☆ حدود آرڈیننس کے اعلان کو آج لگ بھگ ۳۶ سال گزر چکے ہیں' لیکن آج بھی اس کا بالفعل نفاذ نہیں ہوا۔ افسوس صد افسوس!

محاسبۂ اُخروی کا خوف

گزشتہ جمعہ اور آج بھی میں نے متعدد اسالیب سے یہ باور کرایا ہے کہ اسلام نے خوف کے جذبے کو اس دنیا کے نظام میں بھی حدود و تعزیرات کی صورت میں بھرپور طریقے پر جگہ دی ہے' لیکن اس سے بھی بالاتر ایک اور ''خوف'' بھی انسانیت کو دیا ہے اور جو اسلام کا اصل عطیہ (contribution) ہے۔ دنیا کے نظام میں سموئے ہوئے سارے خوف مدہم پڑ سکتے ہیں اور مختلف اسباب سے بے اثر ہو سکتے ہیں' مثلاً جس معاشرے میں کرپشن عام ہو جائے تو اس میں یہ تمام خوف صحیح طور پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ پولیس حتیٰ کہ عدالتی اہل کاروں میں رشوت لینا عام ہو اور رشوت کے ذریعے حقیقی ملزم بھی بچایا جا سکے تو معاشرہ اس احتسابی نظام سے جتنا بے پروا اور بے خوف ہوگا' آج وہ ہمارے سامنے ہے۔ اسی طرح جہاں سفارش کا دور دورہ ہو وہاں بھی احتساب و تعزیر کا یہ خوف بے اثر ہو جائے گا۔ آخر کوئی بڑے سے بڑا جج بھی کسی کا بھائی' کسی کا بیٹا' کسی کا بہنوئی اور کسی کا سالا تو ہوگا۔ کہیں نہ کہیں سے کوئی رشتہ' کوئی تعلق نکال کر approach ہو ہی جائے گی اور پھر رستگاری اور براءت یقینی ہوگی۔ ہمارے اعلیٰ سطح کے عدالتی نظام میں یقیناً ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کے متعلق حُسنِ ظن یہی ہے کہ وہ ان خرابیوں سے محفوظ ہیں' لیکن ہمارے ہاں مجسٹریٹ کی سطح پر ایسے لوگ شاذ ہی ہوں گے جو ان برائیوں سے بچے ہوئے ہوں۔ بہرحال جب کرپشن معاشرے میں موجود ہو تو دنیوی احتساب اور تعزیر و تادیب کا خوف مضمحل بلکہ معدوم ہو جاتا ہے اور صورت فی الواقع یہ بن جاتی ہے کہ ع ہر چند کہیں کہ ہے' نہیں ہے! لیکن ایک خوف ایسا ہے کہ اگر حقیقی طور پر وہ دل میں قائم ہو جائے تو اس سے زیادہ مؤثر خوف کا انسان تصور کر ہی نہیں سکتا۔ جیسے سورۃ العلق میں فرمایا گیا:

﴿كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۝ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۝ اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ۝﴾

''ہرگز نہیں! بے شک انسان حد سے گزرنے پر راغب ہو ہی جاتا ہے' کیونکہ وہ (اس دنیا میں) خود کو بے نیاز دیکھتا ہے۔ (اس کا علاج اس یاددہانی میں ہے کہ) یقیناً تجھے اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔''

یعنی احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی' نواہی و منکرات پر عمل' لوگوں کے حقوق پر دست اندازی اور حقوق العباد کے اتلاف سے اسے اس دنیوی نظام کے تحت کسی پکڑ سے سابقہ پیش نہیں آتا' لیکن اس بے نیازی اور غفلت شعاری کا ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ کہ اس کے ذہن و قلب میں

یہ یقین راسخ اور نقش کالحجر ہو جائے کہ بالآخر اسے جواب دہی اور محاسبے کے لیے ایک دن اپنے رب کے حضور مراجعت کرنی ہے۔ اور عدالت الٰہی' وہ عدالت ہے کہ جہاں نہ رشوت دینے کا امکان ہے اور نہ فدیہ دے کر چھوٹنے کا احتمال ہے۔ جہاں نہ کسی سفارش کے ذریعے رستگاری کا کوئی امکان ہے اور نہ ہی وہاں کوئی ایسا زور آور ہو گا کہ جو عدل کی راہ میں رکاوٹ بن سکتا ہو اور اللہ کے فیصلوں میں دخیل ہو سکے اور ان کو تبدیل کرانے یا ان کو نافذ ہونے سے روکنے کے لیے کھڑا ہو جائے۔ وہاں کسی قسم کی کوئی مدد نہیں مل سکے گی:

﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ﴿۱۲۳﴾﴾ (البقرة)

''اور ڈرو اُس دن سے کہ جس دن کوئی جان کسی دوسری جان کے کچھ بھی کام نہ آسکے گی اور نہ اُس سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا' اور نہ اسے کوئی سفارش ہی فائدہ دے سکے گی اور نہ انہیں کوئی مدد مل سکے گی۔''

خوفِ الٰہی سے عاری لوگ

یہ بات دوسری ہے کہ ہمارے ہاں رب تعالیٰ کے حضور حاضری اور قیامت کے دن جواب دہ ہونے کے خوف کو بھی بعض ہوشیار لوگوں نے دیمک کی طرح سے چٹ کروا دیا ہے۔ آخر شیطان تو غافل نہیں ہے' وہ دغا دیتا ہے اور خاص طور پر ذہین لوگوں پر دین ہی کے نام پر فریب کے جال ڈالتا ہے۔ لہٰذا ایسے لوگوں نے اپنے مذمومہ اور گھڑے ہوئے خیالات کی اشاعت کے ذریعے آخرت کی جواب دہی اور محاسبے کے خوف کو بھی معاشرے کی عظیم اکثریت کے اذہان وقلوب میں انتہائی مضمحل اور کمزور کر دیا ہے۔ شفاعتِ باطلہ کے عقیدے نے اس خوف کی گرفت تقریباً ڈھیلی کر دی ہے۔ اب لوگوں کے قلوب میں (الا ماشاء اللہ) یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ ہم حضور اکرم ﷺ کے نام لیوا ہیں' آنجناب ﷺ کی امت میں سے ہیں' آپؐ کے دامن سے وابستہ ہیں' لہٰذا ہماری تو سفارش ہو ہی جائے گی۔ اس مصرعہ کے مصداق:
''کچھ بھی ہیں لیکن ترے محبوبؐ کی اُمت میں ہیں!'' ہم تو بچا لیے جائیں گے۔ ہم فلاں بزرگانِ دین کے وابستگان میں سے ہیں' ہم تو ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر نکل جائیں گے۔

شفاعت باطلہ کے یہ وہ تصورات ہیں جنہوں نے آخرت کے خوف کی گرفت کو ڈھیلا کر دیا ہے اور ایمان بالآخرت بھی محض زبانی اظہار کی شکل میں رہ گیا ہے۔ صرف الفاظ رہ گئے ہیں

جن میں بعث بعد الموت، حشر ونشر، حساب وکتاب، وزنِ اعمال، جزا وسزا اور جنت ودوزخ کا اقرار ہے، لیکن محض اس زبانی کلامی اقرار واظہار سے اذہان، قلوب اور اعصاب پر وہ گرفت قائم نہیں ہوتی جو اس ایمان بالآخرت ومعاد کے دل میں راسخ اور جاگزیں ہونے سے ہوتی ہے۔

خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا خوفِ آخرت

شفاعتِ حقہ سے انکار نہیں، معاذ اللہ! شفاعت حق ہے، لیکن اس کے لیے قرآن و حدیث میں جو شرائط بیان کی گئی ہیں، ان کا اجمالاً ذکر میں آگے کروں گا۔ اس موقع پر میں چاہوں گا کہ اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں سے چوٹی کے چار کا حال آپ کے سامنے رکھ دوں۔ یہ چار اصحاب وہ ہیں جو عشرہ مبشرہ میں ہیں، یعنی اُن دس خوش بخت وخوش نصیب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں شامل ہیں جن کو ان کی زندگی ہی میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی بشارت دی تھی اور جو بالترتیب خلافت علیٰ منہاج النبوۃ پر بحیثیت خلیفہ راشد ومہدی فائز رہے تھے۔ اُمتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہی کے نہیں بلکہ آفرینش عالم سے لے کر تا قیامِ قیامت، انبیاء ورسل علیہم السلام کی مقدس جماعت کے علاوہ روئے زمین پر ان چار اصحابِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ افضل اور متقی شخص کوئی نہ ہوا ہے، نہ ہوگا۔

یہ چار گلہائے سرسبد الصادق اور المصدوق صلی اللہ علیہ وسلم سے جنت کی بشارت پانے کے باوجود خوفِ آخرت سے کس طرح لرزاں وترساں رہتے تھے، وہ کتبِ سیر میں محفوظ ہے۔

- صدیق اکبر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے متعلق آتا ہے کہ جب قیامت وآخرت کا تذکرہ ہوتا تھا تو لرز جاتے تھے، کانپ اٹھتے تھے اور حسرت کے ساتھ فرمایا کرتے کہ کاش میں ایک چڑیا ہوتا جو درختوں پر چہچہاتی اور مگن رہتی ہے۔ اس لیے کہ اس سے کوئی محاسبہ نہیں ہوگا، اسے کوئی جواب دہی نہیں کرنی نہیں ہوگی! — کاش میں گھاس کا ایک تنکا ہوتا جو جل جاتا ہے اور ہمیشہ کے لیے نیست ونابود ہو جاتا ہے، اس لیے کہ اس سے بھی میدانِ حشر میں کوئی پوچھ گچھ نہیں ہوگی! — کاش مجھے یہ شرفِ انسانیت نہ ملا ہوتا جو ایک طرف شرف ہے، لیکن دوسری طرف حساب کتاب اور جواب دہی ومسئولیت کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔
- فاروقِ اعظم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وقتِ آخر ہے اور عظام صحابہ کرامؓ آپ کو تسلی دے رہے ہیں کہ آپؓ سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم راضی تھے، یقیناً اللہ بھی آپؓ سے راضی ہوگا، لیکن وہ اشکبار ہیں اور اپنے مناقب ومراتب، اپنے کمالات اور جہاد وقتال فی سبیل اللہ کے

باوصف کہہ رہے ہیں کہ اگر میں عدالت الٰہی سے برابر سرابر بھی چھوٹ جاؤں تو میں اسے اپنے لیے بہت بڑی کامیابی سمجھوں گا۔

- ذُوالنّورین حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ جب کسی قبر پر کھڑے ہوتے تو ان کی کیفیت یہ ہوتی تھی کہ روتے روتے ان کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو جاتی تھی۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ آپؓ دوزخ و جنت کے احوال کے تذکرے پر اتنے اشکبار نہیں ہوتے جتنا کہ قبر پر ہوتے ہیں۔ جواب میں کہا کہ ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ قبر جواب دہی کی پہلی منزل ہے۔ اگر کوئی اس سے نجات پا گیا تو اس کے بعد بھی آسانی ہے' لیکن اگر اس سے ہی نجات نہ پائی تو اس کے بعد اس سے بھی زیادہ سختی ہے'' —— حضرت عثمانؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''میں نے قبر سے زیادہ کسی مقام کو ہیبت ناک نہیں دیکھا''۔ اس حدیث کی روایت کے موقع پر بھی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی جاری ہو جاتی تھی۔
- اسد اللہ ورسولہٖ حضرت علی حیدر رضی اللہ عنہ کی شجاعت اظہر من الشّمس ہے۔ آپؓ کا جسم فولاد کی طرح سخت تھا' لیکن حال یہ تھا کہ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تھے تو یہ فولادی جسم خشیت وخوفِ الٰہی سے تھر تھراتا رہتا تھا اور جسم رقت کی وجہ سے نرم پڑ جاتا تھا۔

یہ ہے وہ اصل خوف جو اسلام ہر مدعیٔ ایمان کے دل میں راسخ اور جاگزیں کرنا چاہتا ہے۔ اگر یہ خوف فی الواقع دل میں قائم ہو جائے تو انسان کی سیرت وکردار پر اس کی اثر پذیری کا جو عالم ہوگا' وہ مندرجہ بالا مثالوں سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ اس سے زیادہ مؤثر ذرائع خوف کا تصور بھی ممکن نہیں ہے۔

شفاعت کا تصوّر: قرآنی آیات کی روشنی میں

میں نے عرض کیا تھا کہ شفاعتِ مطلقہ کا جو تصور اور عقیدہ عام طور پر ہمارے ہاں رائج ہے' وہ باطل ہے اور جس شفاعت کا قرآن اور احادیث میں ذکر ہے' وہ مشروط ہے۔ اس وقت تفصیل کا موقع نہیں ہے' البتہ اس موضوع پر ''حقیقت واقسامِ شرک'' پر میری تقاریر (اور کتاب) میں مفصّل بحث موجود ہے۔ یہاں میں قرآنی آیات کی روشنی میں اختصار کے ساتھ بس اتنا عرض کروں گا کہ قرآن نے اصلاً تو شفاعت کی نفی کی ہے اور جہاں اس کا اثبات ہے وہاں اس کی شرائط بھی بیان کر دی گئی ہیں۔

شفاعت کی کامل نفی سورۃ البقرۃ کی آیات ۴۸، ۱۲۳ اور ۲۵۴ میں بیان ہوئی ہے۔ پہلی اور دوسری آیات میں یہود کو خطاب کر کے شفاعت کی بایں الفاظ کُلّی نفی کی گئی ہے:

﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾﴾

''اور ڈرو اُس دن سے کہ جس دن کام نہ آ سکے گی کوئی جان کسی دوسری جان کے کچھ بھی اور نہ کسی سے کوئی سفارش قبول کی جائے گی اور نہ کسی سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا اور نہ انہیں کوئی مدد مل سکے گی۔''

اور آیت ۱۲۳ کے الفاظ بھی بعینہٖ یہی ہیں، بس ترتیب کا فرق ہے:

﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾﴾

''اور ڈرو اُس دن سے کہ جس دن کوئی جان کسی دوسری جان کے کچھ بھی کام نہ آ سکے گی اور نہ اُس سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا اور نہ اسے کوئی سفارش ہی فائدہ دے سکے گی اور نہ انہیں کوئی مدد مل سکے گی۔''

جبکہ آخر الذکر آیت (۲۵۴) میں اہل ایمان کو متنبہ کرتے ہوئے فرمایا گیا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِىَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۭ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۵۴﴾﴾

''اے اہلِ ایمان! خرچ کرو اُس میں سے جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اس سے پہلے کہ وہ دن آ دھمکے جس میں نہ کوئی خرید و فروخت ہوگی، نہ کوئی دوستی کام آئے گی اور نہ کوئی شفاعت مفید ہوگی۔ اور جو انکار کرنے والے ہیں وہی تو ظالم ہیں۔''

سورۃ الزمر کی آیت ۴۴ میں بطور کلیہ فرمایا گیا کہ شفاعت صرف اور صرف اللہ وحدہ لاشریک کا اختیار ہے:

﴿قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ۭ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ﴾

''(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے کہ شفاعت تو کُل کی کُل اللہ تعالیٰ کے اپنے اختیار میں ہے، جس کے لیے آسمانوں اور زمین (یعنی اس کُل کائنات) کی بادشاہی اور حکومت ہے۔''

سورۃ الانعام کی آیت ۷۰ میں نہایت پُرجلال اور پُرہیبت اسلوب میں شفاعتِ مطلقہ و باطلہ کی تردید کی گئی ہے۔ فرمایا:

﴿وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ۚ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ ۚ﴾

''چھوڑ وان لوگوں کو جنہوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنا رکھا ہے اور جنہیں دنیا کی زندگی فریب میں مبتلا کیے ہوئے ہے۔ ہاں مگر یہ قرآن سنا کر نصیحت اور تنبیہ کرتے رہو کہ کہیں کوئی شخص اپنے کرتوتوں کے وبال میں گرفتار نہ ہو جائے (اس حال میں) کہ اللہ سے بچانے والا کوئی حامی و مددگار اور کوئی سفارشی اس کے لیے نہ ہو۔''

پھر سورۃ السجدۃ کی آیت ۴ میں بھی شفاعت کی مکمل نفی کرتے ہوئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا:

﴿مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ ۭ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝﴾

''نہیں ہے تمہارے لیے اُس کے مقابلے میں کوئی حمایتی اور نہ کوئی سفارش کرنے والا۔ تو کیا تم نصیحت نہیں پکڑتے!''

شفاعت کی شرائط: یہاں تک تو اُن آیات کا بیان تھا جن میں شفاعت کی مکمل طور پر نفی وارد ہوئی ہے' آگے ان آیات کا تذکرہ ہے جن میں شفاعت کا اثبات تو موجود ہے' مگر ساتھ ہی اس کی شرائط بھی بیان کر دی گئی ہیں۔ قرآن مجید میں شفاعت کے اثبات کے ساتھ تین شرائط بیان ہوئی ہیں: (۱) اِذن (اجازت)' (۲) رضا (پسند)' اور (۳) صواب (صحیح وحق بات)۔ آیۃ الکرسی' مجھے توقع ہے کہ ہم سب کو یاد ہو گی' اس میں فرمایا: ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ (البقرۃ:۲۵۵) ''کون ہے وہ جو اللہ کے سامنے شفاعت کر سکے اس کی اجازت کے بغیر؟'' اس استفہامی اسلوب کے تیور پہچانیے۔ ان الفاظ میں شفاعت کی پہلی اور بنیادی شرط کو بیان کر دیا گیا کہ اگر کسی کی بھی شفاعت ہو گی تو وہ صرف اور صرف اللہ کی اجازت کے ساتھ ہو گی۔ اذنِ رب کے بغیر تو کسی شفاعت کا امکان تک موجود نہیں ہے۔

اسی آیت میں آگے فرمایا: ﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَاۗءَ ۚ﴾ ''وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے سامنے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے' اور وہ احاطہ نہیں کر سکتے اس کے علم کا کچھ بھی' مگر یہ کہ جو وہ خود چاہے''۔ یعنی ہر بات اس کے علم کامل میں موجود ہے اور اس سے کوئی چیز بھی پوشیدہ نہیں ہے۔ جو کچھ ہو چکا ہے اور گزر چکا ہے' وہ بھی اس کے علم میں ہے اور جو کچھ ہونے والا اور گزرنے والا ہے' وہ بھی اس کے علم کامل میں موجود ہے۔ سورۃ الانبیاء کی آیت ۲۸ میں شفاعت کی دوسری شرط کا تذکرہ ہے۔ فرشتوں کے

بارے میں فرمایا گیا:

﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴿۲۸﴾﴾

''جو کچھ ان کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے اس سے بھی وہ باخبر ہے۔ وہ کسی کی سفارش نہیں کرتے' بجز اس کے جس کے حق میں سفارش سننے پر اللہ راضی ہو اور وہ اس کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں۔''

اس آیت مبارکہ میں 'اذن' کے ساتھ 'رضا' کا ذکر بھی آ گیا۔ ساتھ ہی یہ بھی بیان کر دیا کہ جن کو شفاعت کی اجازت ملے گی وہ اللہ تعالیٰ کی خشیت اور اس کی ناراضگی سے خوف زدہ ہوں گے کہ کہیں ایسے شخص کی شفاعت نہ ہو جائے جس کی معافی اللہ کو منظور نہ ہو۔ سورۂ طٰہٰ میں اس بات کو بایں الفاظ بیان فرمایا گیا:

﴿يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا ﴿۱۰۹﴾﴾

''اس روز شفاعت کارگر نہ ہوگی اِلا یہ کہ کسی کو رحمٰن اس کی اجازت دے اور اس کی بات سننا پسند کرے۔''

اس آیت میں بھی اذن اور رضا دونوں کا ذکر ہو گیا۔ پھر یہاں بھی اگلی آیت میں اللہ ربّ العزت نے اپنے علم کامل کا ذکر فرما دیا تاکہ یہ مغالطہ نہ ہو کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے علم میں (معاذ اللہ) کوئی کمی ہے:

﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا ﴿۱۱۰﴾﴾

''وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے سامنے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اور وہ احاطہ نہیں کر سکتے اُس کے علم کا۔''

مندرجہ بالا آیات میں شفاعت کی دو شرائط کو بیان کیا گیا: اذنِ رب اور رضائے رب' جبکہ سورۃ النبا کی آیت ۳۸ میں تیسری شرط 'صواب' کا تذکرہ ہے' فرمایا:

﴿يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۙ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ﴿۳۸﴾﴾

''جس روز روح اور ملائکہ صف بستہ کھڑے ہوں گے۔ کوئی نہ بولے گا سوائے اس کے جسے رحمٰن اجازت دے اور جو ٹھیک بات کہے۔''

شفاعت کا تصوّر: احادیث کی روشنی میں

اس ضمن میں صرف دو احادیث پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ یہ دونوں احادیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((كُلُّ اُمَّتِيْ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ اَبٰى)) قَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ: وَمَنْ يَّأْبٰى؟ قَالَ: ((مَنْ اَطَاعَنِيْ دَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ عَصَانِيْ فَقَدْ اَبٰى)) (۲)

''میری امت کے تمام افراد جنت میں داخل ہوں گے سوائے اس شخص کے جو (داخل ہونے سے) انکار کرے گا''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: (یا رسول اللہ! جنت میں داخلے سے) کون انکار کرے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے میری اطاعت کی' وہ جنت میں داخل ہو گیا اور جس نے میری نافرمانی کی تو اُس نے (گویا جنت میں داخل ہونے سے) انکار کر دیا۔''

دوسری حدیث بھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((تَرِدُوْنَ عَلَيَّ غُرًّا مُحَجَّلِيْنَ مِنْ آثَارِ الْوُضُوْءِ، وَلَيُصَدَّنَّ عَنِّيْ طَائِفَةٌ مِنْكُمْ فَلَا يَصِلُوْنَ، فَاَقُوْلُ : يَا رَبِّ هٰؤُلَاءِ مِنْ اَصْحَابِيْ)) فَيَجِيْئُنِيْ مَلَكٌ فَيَقُوْلُ :وَهَلْ تَدْرِيْ مَا اَحْدَثُوْا بَعْدَكَ ! (۳)

''(روزِ محشر) تم میرے پاس اس حالت میں آؤ گے کہ وضو کے سبب تمہاری پیشانیاں روشن ہوں گی اور تمہارے ہاتھ پاؤں چمکتے ہوں گے۔ تم میں سے ایک جماعت کو میرے پاس آنے سے روک دیا جائے گا۔ میں عرض کروں گا: اے میرے رب! یہ تو میرے دوست ہیں''۔ اس کے جواب میں مجھ سے کہا جائے گا کہ آپؐ کو معلوم بھی ہے کہ آپؐ کے بعد انہوں نے کیا کیا کیا ہے!''

میدانِ حشر میں آفرینش عالم سے لے کر تا قیامِ قیامت کی تمام بنی نوع انسان حاضر ہو گی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام انسانوں کے سامنے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علوِ مقام و مرتبہ کے اظہار کے لیے آپؐ کو بالخصوص شفاعت کا مجاز کیا جائے گا۔ اسی طرح دوسرے انبیاء و رسل علیہم السلام اور جملہ اُمم

---

(۲) صحیح البخاری' کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ' باب الاقتداء بسنن رسول اللہ ﷺ۔

(۳) صحیح مسلم' کتاب الطھارۃ' باب استحباب اطالۃ الغرۃ والتحجیل فی الوضوء۔

کے صدیقین، شہداء اور صالحین کے مرتبہ کے اظہار کے لیے ان کو بھی شفاعت کی اجازت ہو گی۔ لیکن یہ تمام شافعین صرف ایسے لوگوں ہی کی شفاعت کریں گے جن کی معافی اور مغفرت کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کی مشیت مطلقہ اور علم کامل میں پہلے سے موجود ہوگا اور جن کا معاملہ یہ ہوگا کہ امتحان میں کامیاب ہونے میں قلیل margin سے رہ گئے ہوں گے۔ واللہ اعلم!

تعمیرِ سیرت و کردار کے لیے حقیقی ایمان ناگزیر ہے

اب ہم اپنے موضوع کی طرف آتے ہیں —— میں عرض کر رہا تھا کہ اسلام نے انسانی جذبات کو تعمیرِ سیرت و کردار کے لیے دو اساسات عطا کی ہیں۔ پہلی محبت کی مثبت اساس ہے، یعنی محبت اللہ کی اور اس کے رسول ﷺ کی، اور اُس کے راہ میں جہاد کی —— جہاد کیا ہے؟ نظامِ عدل و قسط کو دنیا میں قائم کرنے کی جدوجہد کی ہمارے دین میں اہمیت کیا ہے؟ اور قرآن حکیم اور ہمارے دین کے مجموعی مزاج و نظام سے اس کا تعلق کیا ہے؟ ان تمام سوالات کے بارے میں تفصیلی بیان، ان شاء اللہ، آج بعد نمازِ مغرب جناح ہال میں مرکزی انجمن خدام القرآن کی دس سالہ تقریب کے افتتاحی اجلاس میں ہوگا۔

اب میں آج کی گفتگو کو مزید آگے بڑھاتا ہوں —— اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت پیدا کرنا اور آخرت کا خوف دل میں قائم کر دینا، ان دونوں کو جمع کیجیے تو اس کی صحیح تعبیر یوں ہوگی کہ معاشرے میں اصل ضرورت تجدید ایمان کی ہے، یا یوں کہہ لیجیے کہ حقیقی ایمان درکار ہے۔ گویا تمام گفتگو کا حاصل یہ نکلا کہ تعمیرِ سیرت و کردار کے لیے ہمارے معاشرے کی اصل ضرورت یہ ہے کہ قلوب میں حقیقی ایمان پیدا ہو۔

ایمان کے ذرائع

اس ضمن میں آج میں ایک دقیق اور پیچیدہ بحث آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں اور آپ حضرات سے درخواست کرتا ہوں کہ توجہات کو میری گفتگو پر خوب مرتکز فرمالیں۔ اگرچہ اس مسئلہ پر پچھلے جمعہ کو بھی گفتگو ہو چکی ہے، لیکن میں چاہوں گا کہ مزید گہرائی میں اتر کر اس کو زیادہ سے زیادہ قابلِ فہم بنانے کی کوشش کروں۔ ایک نہایت اہم سوال یہ ہے کہ ایمان کا سرچشمہ اور منبع کون سا ہے؟ ایمان ملتا کہاں سے ہے؟ اس ایمان کے لیے ہم رجوع کدھر کریں؟ میں چاہتا ہوں کہ ان سوالات کے تمام پہلوؤں کو آپ اچھی طرح سمجھ لیں۔ محض جذباتی و عقیدت مندانہ انداز میں نہیں، بلکہ اس بات کو آپ تجزیاتی (analytical) انداز میں سمجھنے کی کوشش فرمائیں۔

ایمان کا پہلا منبع: صحبتِ صاحبِ یقین

یہ بات جان لیجیے' کہ ایمان کے دو ہی ذرائع اور مآخذ (sources) ممکن ہیں' تیسرا کوئی نہیں۔ ایک ذریعہ (source) ہے: صحبتِ صاحبِ یقین' ع ''صحبت صالح ترا صالح کند''۔ کسی صاحبِ ایمان و یقین کی صحبت میسر آ جائے تو آپ میں بھی ایمان پیدا ہو جائے گا۔ یہ بالکل وہ طبعی عمل ہے جیسے آپ آگ کی بھٹی کے سامنے بیٹھیں گے تو حرارت خود بخود آپ میں سرایت کرے گی' اور اگر آپ کسی سرد خانے میں ہیں تو اس کی برودت اور ٹھنڈک آپ کو بالفعل پہنچے گی۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ بھٹی واقعی آگ کی بھٹی ہو اور اس میں حقیقی آگ روشن ہو' یا سرد خانے میں ٹھنڈ کا فی الواقع انتظام ہو تو حرارت یا برودت آپ کو محسوس نہ ہو اور اس کے اثرات آپ پر مرتب نہ ہوں۔ اسی طرح صاحبِ یقین و ایمان کی صحبت سے واقعتاً یقین و ایمان پیدا ہوتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کا کامل و اکمل ایمان

البتہ اس میں دو باتیں قابلِ لحاظ ہیں جن کا پیشِ نظر رہنا ضروری ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جس نوع کی وہ بھٹی ہے اسی نوعیت کا ایمان آگے پہنچے گا۔ اب یہ بات جان لیجیے کہ کامل ایمان و یقین کی بھٹی تو تھی ذاتِ محمد ﷺ کی۔ وہ ایمان جو ہر پہلو سے مکمل ہی نہیں اکمل ہے۔ وہ ایمان جس میں شعوری و اکتسابی پہلو بھی شامل ہے۔ ذہن میں رکھیے کہ غارِ حرا کی خلوتوں میں جو غور و فکر ہوا ہے تو انسان کی اپنی فکر کی جو بلندی ہے' جہاں تک اس کے اپنے غور و فکر کی رسائی ممکن ہے وہاں تک آپؐ ان خلوتوں میں پہنچ گئے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ اس مقام پر کھڑے گویا دستک دے رہے ہیں کہ جس سے آگے جب تک وحی کا دروازہ نہ کھلے' انسان کی رسائی ممکن نہیں ہے۔ اس مقام تک پہنچنے کے بعد وحی کا دروازہ کھلا ہے۔ یہاں اچانک علامہ اقبال کا ایک شعر ذہن میں آ گیا' اسے بطورِ تفہیم آپ کو سنائے دیتا ہوں۔ اس شعر کو بلا تشبیہہ سامنے رکھئے گا' کہیں اسے من و عن چسپاں نہ کر دیجیے گا۔ شعر ہے:

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں!
میرے مولا مجھے صاحبِ جنوں کر!

اس شعر کے حوالے سے دو مرحلے سامنے آ جائیں گے۔ پہلا یہ کہ فکرِ انسانی اپنی اس بلندی تک پہنچ گئی ہے جہاں تک اس کی رسائی ممکن ہے اور اس مقام تک پہنچ کر حقیقت الحقائق کے دروازے پر دستک دے رہی ہے۔ اس کے آگے کا مرحلہ خالص وہبی ہے۔ وہ خالص اللہ کا فیصلہ اور

اس کی مشیت ہے۔اس کا تعلق انسان کے اپنے ذاتی اکتساب اور ذاتی محنت سے نہیں ہے، وہ مرحلہ اجرائے وحی کا مرحلہ ہے، جیسے سورۃ الضحیٰ میں فرمایا: ﴿وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝۷﴾ ''(اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ کو تلاشِ حقیقت میں سرگرداں و متلاشی پایا تو (ہم نے پردے اٹھا دیے اور) ہدایت کے دروازے کھول دیے''۔اسی کے متعلق سورۃ الشوریٰ کی آخری دو آیات میں فرمایا:

﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِىْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَاِنَّكَ لَتَهْدِىْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۵۲ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِىْ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ؕ اَلَآ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ ۝۵۳﴾

''اور (اے نبی ﷺ!) اسی طرح ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے ایک روح اپنے امر میں سے۔آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے، لیکن اس (قرآن) کو ہم نے ایسا نور بنایا ہے جس کے ذریعے سے ہم ہدایت دیتے ہیں اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں۔اور آپؐ یقیناً سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیتے ہیں۔اُس اللہ کے راستے کی طرف جس کی ملکیت ہے ہر وہ شے جو آسمانوں میں ہے اور ہر وہ شے جو زمین میں ہے۔آگاہ ہو جاؤ! تمام معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹ جائیں گے۔''

پھر وہ وقت بھی آیا کہ خاتم النبیین وسید المرسلین ﷺ کو معراج عطا ہوئی اور آپؐ کو عالم ملکوتی کی بنفسِ نفیس سیر کرائی گئی، جیسے کہ بیان ہوا سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِىْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِىْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ۝۱﴾

''پاک ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے دور اس مسجد تک جس کے ماحول کو اس نے برکت دی ہے تاکہ اسے اپنی کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کرائے۔ حقیقت میں وہی ہے سب کچھ سننے والا اور دیکھنے والا۔''

اور پھر اس کا مختصر لیکن انتہائی بلیغ نقشہ سورۃ النجم میں بایں الفاظ کھینچا گیا:

﴿وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۝۱۳ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ۝۱۴ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ۝۱۵ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ۝۱۶ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ۝۱۷ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ۝۱۸﴾

''اور انہوں نے اس (جبرائیلؑ) کو ایک اور مرتبہ بھی اترتے دیکھا ہے۔ جہاں پاس

ہی جنت الماویٰ ہے۔ اُس وقت سدرہ پر چھا رہا تھا جو کچھ چھا رہا تھا۔ نگاہ نہ چندھیائی اور نہ حد سے متجاوز ہوئی۔ اور انہوں نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھ لیں۔''

نبی اکرم ﷺ ان دو مراحل سے گزرے ہیں۔ انسان اپنے شعور کی بدولت فکر کے جس انتہائی بلند مقام تک پہنچ سکتا ہے' آنحضورؐ اس بلندی تک پہنچے ہیں اور پھر وہاں پہنچ کر حقیقت الحقائق کے دروازے پر دستک دی۔ چنانچہ پردے اٹھا دیے گئے' دروازے کھول دیے گئے اور خالصتاً وہبی طور پر نبوت و رسالت کی آخری و بلند ترین مسند پر فائز فرمائے گئے۔ پس یہ ہے ایمان جناب محمد رسول ﷺ کا کہ اس ایمان کی بھٹی سے جو نفوسِ قدسیہ فیض یاب ہوئے ان کا معاملہ تو واقعتاً استثنائی (exceptional) ہے۔ اصحابِ رسول علیٰ صاحبہم الصلوٰۃ والسلام والا ایمان تو اب دنیا میں دوبارہ آ ہی نہیں سکتا' اس لیے کہ آنحضور ﷺ کے ایمان کی بھٹی اب اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ کے فیض صحبت سے جو ایمان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حاصل ہوا' وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد ہے۔

البتہ بعد کے ادوار میں کچھ اصحاب نے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ انسان اپنی خوش عقیدگی اور اپنے اعمالِ صالحہ کے ذریعے بھی ایمان حاصل کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ اس کو اس طرح سمجھئے کہ اگر دل میں حقیقی ایمان یا اس کی کوئی رمق موجود ہے تو وہ لازماً عمل پر اثر انداز ہوتی ہے۔ یعنی جو اعمال شریعت نے اہلِ ایمان کو عطا کیے ہیں' اگر ایک شخص ان پر دوام کے ساتھ عمل پیرا ہوگا اور ان کو بجالانے کا اہتمام رکھے گا تو اس سے بھی دل میں ایمان پیدا ہوگا' اس کو جلا اور نشو و نما حاصل ہوگی اور اس میں نکھار آئے گا۔ یہ دو طرفہ عمل ہے۔ چنانچہ اکتسابِ ایمان کا جو طریقہ اہل تصوف نے اختیار کیا ہے اور روحانی ریاضتوں اور مشقتوں کے نام پر جو اعمال تجویز کیے ہیں' ان سے بھی قلب انسانی میں ایمان کی کیفیات پیدا ہوتی ہیں — میں اس کا انکار نہیں کرتا — لیکن یہ جان لیجئے کہ اکثر و بیشتر یہ ایک غیر شعوری اور غیر اکتسابی ایمان کا معاملہ ہے۔ ایسے حضرات کی صحبت سے جو ایمان حاصل ہوگا' اس میں بھی شعوری اور اکتسابی ایمان کا حصہ نہیں ہوگا۔ اس طرح وہ ایمان میسر نہیں آئے گا جو صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو حاصل ہوا تھا' بلکہ ایمان اسی نوعیت کا ملے گا کہ جس نوعیت کا اور جس طریقے سے ان اصحابِ یقین کو حاصل ہوا تھا' جن کی صحبت سے فیض یاب ہوا جا رہا ہوگا۔ پھر نوعیت اور تاثیر کے لحاظ سے ایسے ایمان میں یکسانیت اور یک رنگی ہوگی۔

ایمان کا دوسرا منبع: قرآن مجید

اب آتے ہیں ایمان کے دوسرے منبع اور سرچشمہ کی طرف۔ قرآن حکیم ایمان کا دوسرا سرچشمہ اور منبع ہے۔ آج میں آپ حضرات کی خصوصی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ خود نبی اکرم ﷺ کے بارے میں قرآن مجید کی گواہی کیا ہے۔ وہ ایمان جو آنحضور ﷺ کے قلب مبارک میں بالقوّہ (potentially) موجود تھا' اس کا بالفعل وجود میں آنا اور اس کا ایک حقیقت (actuality) کی شکل اختیار کرنا' اس میں اصل دخل قرآن مجید کو حاصل ہے۔ اس کے لیے سورۃ الشوریٰ کی آیت ۵۲ کی طرف رجوع کیجیے' جو میں پہلے آپ کو سنا چکا ہوں۔ ذرا غور کیجیے' الفاظ اور اسلوب ایسا ہے کہ ذرا سی بے احتیاطی بمصداق ع ''ہشدار کہ رہبر دمِ تیغ است قدم را!'' نقصان اور مغالطے کا سبب بن سکتی ہے۔ لہٰذا اس مقام پر بڑے محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔ ''کتاب'' کے بارے میں تو واضح ہے کہ اس سے مراد قرآن مجید ہی ہے۔ اس لیے کہ آنحضور ﷺ پیدا ہوئے مکہ میں اور خاندانِ بنی اسماعیلؑ میں' اور ان کے پاس کوئی کتابِ سماوی اور کوئی شریعت نہیں تھی۔ لیکن یہ بات کہ ''حضور ﷺ ایمان کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتے تھے'' یا یہ کہ ''آنحضور ﷺ کے قلب میں ایمان بھی موجود نہیں تھا'' یہ کہتے ہوئے میری زبان لڑکھڑاتی ہے۔ معاذ اللہ! لیکن یہاں الفاظ کا اسلوب اسی مفہوم کا حامل ہے —— میں نے عرض کیا کہ نبی آخرالزماں حضرت محمد ﷺ کے قلبِ مبارک میں ایمان بِالقُوّۃ (potentially) موجود تھا' لیکن اس کو حقیقی (actual) شکل اختیار کرنے کے لیے ایک خارجی تحریک کی ضرورت تھی اور وہ وحی الٰہی تھی۔ لہٰذا اس آیت سے قبل وحی کی مختلف اقسام کا ذکر کیا گیا اور پھر فرمایا: ﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ﴾ ''اور اسی طرح (اے محمد ﷺ!) ہم نے اپنے حکم سے ایک روح آپ کی طرف وحی کی۔''

یہ وہ نور ہے جس سے محمد ﷺ کے قلب مبارک کا آئینہ جگمگا اُٹھا۔ قلب محمدیؐ میں آئینہ تو موجود تھا' اس میں استعدادِ کامل بالقوہ موجود تھی' لیکن آئینے کے سامنے شمع آئے گی تو وہ جگمگائے گا۔ وہ شمع کون سی ہے! وہ نور کون سا ہے! وہ شمع اور وہ نور یہی قرآن مجید ہے۔ فرمایا: ﴿مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے! لیکن ہم نے اس قرآن کو نور بنایا۔'' (۴)

(۴) رسول اللہ ﷺ کے قرآن پر ایمان لانے کے سلسلے میں سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۸۵ کے اس ◄◄

نَّهْدِیْ بِہٖ میں ''ہ'' کی ضمیر غائب قرآن مجید کے لیے آئی ہے: ﴿نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ﴾ ''(اور یہ نور اس لیے بنایا گیا کہ) اس قرآن کے ذریعے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت کے راستے کی طرف رہنمائی کرتے ہیں'' —— گھپ اندھیرے میں راستہ دیکھنے کے لیے روشنی (نور) کی ضرورت ہوتی ہے اور شرک و جاہلیت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے کو دور کرنے اور سیدھی راہ دیکھنے کے لیے بھی نور کی ضرورت تھی، جس کے لیے سورۃ الفاتحہ میں انسان کو یہ دعا کرنے کی تلقین کی گئی ہے: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝﴾ تو اس راہ کی راہنمائی کے لیے قرآن مجید نور بنا کر نازل کر دیا گیا ہے۔

زیر مطالعہ آیت کے اختتام پر فرمایا: ﴿وَاِنَّكَ لَتَهْدِیْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۲۵﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) یقیناً آپ سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرنے والے (بن گئے) ہیں''۔ اس بات کو یوں بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ اے نبی ﷺ! جب آپ کے قلبِ مبارک کا آئینہ قرآن مجید کے نور سے جگمگا اٹھا ہے تو اب آپؐ وہ بھٹی بن گئے ہیں جس سے لوگوں کو نورِ ایمان حاصل ہوگا۔ اب آپؐ لوگوں کو صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت دینے والے بن گئے —— لیکن بنے اسی قرآنِ مجید فرقان حمید کے طفیل سے ہیں۔ یہی ہے وہ نور جس نے آپؐ کے قلبِ مُصفّا کو جگمگا دیا اور قلب مبارک نورِ ایمان کی بھٹی بن گیا جس سے حرارتِ ایمانی ماحول میں پھیل گئی۔

نورِ قرآن، تمام ظلمتوں کو دور کرنے والا ہے

اب دیکھئے اسی مضمون کو ایک دوسرے اسلوب سے سورۃ الحدید کی آیت ۹ میں بایں الفاظ بیان فرمایا گیا ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۝۹﴾

''وہ اللہ ہی ہے جو اپنے بندے پر صاف صاف آیتیں نازل کر رہا ہے تاکہ تمہیں

◄◄ ابتدائی حصے سے بھی استدلال کیا جا سکتا ہے: ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ﴾ ''ایمان لائے رسول (ﷺ) اس چیز پر جو نازل کی گئی اُن کی جانب اُن کے ربّ کی طرف سے اور مؤمنین بھی (ایمان لائے۔)''۔ نیز سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۵ کے اس درمیانی حصے سے بھی: ﴿وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ﴾ ''اور آپؐ کہہ دیجیے کہ میں تو اس کتاب پر ایمان لایا ہوں جو اللہ نے نازل کی ہے۔'' (مرتب)

تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تم پر نہایت شفیق اور مہربان ہے۔''

یہ قرآن مجید کی آیاتِ بینات ہی ہیں جو لوگوں کو الحاد کے گھٹا ٹوپ اندھیروں' شرک کے اوہام کے اندھیاروں اور جاہلیت کی تمام تاریکیوں' الغرض ہر قسم کے ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ سے نکال کر ایمان' یقین اور توحید کی روشنی میں لاتی ہیں۔ یہ نورِ قرآن ہی ہے جو ہر نوع کی تاریکیوں اور ہر قسم کے اندھیروں کا پردہ چاک کر کے صراطِ مستقیم کو روشن کرتا ہے اور اس منور راہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے.....! پس معلوم ہوا کہ اس قرآن حکیم کو اگر ایمان کا سرچشمہ اور منبع نہ بنایا جائے اور صرف چند روحانی ریاضتوں و مشقتوں اور کچھ اوراد و وظائف اور کچھ اعمال کے ذرائع سے ایمانِ حقیقی پیدا کرنے پر ہی توجہ مرکوز کر دی جائے تو مطلوبہ ایمان پیدا نہیں ہوگا۔

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں اور اب پھر اعادہ کرتا ہوں کہ میں یہ دعویٰ ہرگز نہیں کرتا کہ یہ ذرائع بالکل غیر مؤثر ہیں۔ ایک شخص اگر نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ اور اذکارِ مسنونہ و ماثورہ پر دوام کے ساتھ عمل کر رہا ہو اور وہ شخص مراقبے بھی کر رہا ہو' ذکر اللہ کی ضربیں بھی اپنے قلب پر لگا رہا ہو تو ان طریقوں سے بھی دل میں ایمان پیدا ہوتا ہے۔ میں ہرگز اس کا منکر نہیں ہوں' لیکن وہ ایمان جو قرآن حکیم میں غور و فکر اور تدبّر سے اخذ کیا جائے گا اور اس کے ذریعے سے وجود میں آئے گا' اس ایمان میں اور پہلے ایمان میں نوعیت اور کیفیت کے اعتبار سے (qulitative) فرق رہے گا۔ وہ ایمان جو ایک بندۂ مومن نورِ قرآن سے حاصل یا اخذ کرتا ہے وہ نوعیت کے لحاظ سے بڑا عظیم ایمان ہے۔ اس لیے کہ نورِ قرآن کو اللہ تعالیٰ نے بنیادی طور پر اسی مقصد کے لیے نازل فرمایا ہے۔ یہ وہ نور ہے جس نے قلبِ محمد ﷺ کے دل میں موجود بالقوّہ (potentially) ایمان کو بالفعل (actually) ایمان بنایا ہے۔ وہی نور درحقیقت سرچشمہ یقین اور منبع ایمان ہے۔ یہی قرآن فی الواقع صحبتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا قائم مقام ہے۔ (۵) اس کی طرف رجوع ہوگا تو درحقیقت فکر کی صحیح اساس ذہن میں قائم ہوگی اور نتیجتاً قلب میں جو

---

(۵) نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد جب بعض تابعین یا اصاغر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے آنحضور ﷺ کی سیرتِ مطہرہ کے بارے میں دریافت کیا تو حضرت صدیقہؓ نے فرمایا: کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟ انہوں نے اثبات میں جواب دیا تو آپؓ نے فرمایا: کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ یعنی آپؐ کی سیرتِ مبارکہ قرآن کے عین مطابق تھی۔ (مرتب)

شعوری ایمان وجود میں آئے گا' وہ ایمان محض dogma' خوش عقیدگی اور وراثتاً ملنے والا ایمان نہیں رہے گا بلکہ انسان کے فکر وعمل اور قلب و ذہن کے ساتھ مربوط ہوگا۔ اور ایک پختہ' مضبوط (integrated) اور مسحور کن شخصیت وجود میں آئے گی کہ جہاں فکر وعمل' عقل و دل اور حکم ونظر یہ سب یک جا ہو جاتے ہیں اور ان میں کوئی تضاد اور تصادم نہیں رہتا' بلکہ ان میں باہم پیوستگی اور ربط کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

اس حقیقی ایمان کے حصول کا ذریعہ قرآن مجید ہے۔ اور جس نے قرآن مجید سے ایسا ایمان حاصل کر لیا تو ایسے شخص یا اشخاص کی صحبت کی تاثیر سے جو ایمان پھیلے گا تو اس ایمان میں بھی یہ وصف سرایت کرے گا۔ اگر ایمان دوسری نوعیت کا ہے تو ظاہر بات ہے کہ وہ اگر پھیلے گا تو اسی نوعیت کا پھیلے گا۔

تبلیغی جماعت: عوامی سطح پر ایمان کی ایک عظیم تحریک

اس موقع پر میں یہ عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس دور میں عوامی سطح پر ایمان کی ایک عظیم تحریک ''تبلیغی جماعت'' کے ذریعے سے چل رہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس تحریک سے عملاً وابستگان میں ایمان و یقین کی ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے' لیکن اس میں وہی فرق ہے جس کو میں نے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ اس یقین و ایمان کے اندر ''فکر'' کی ہم آہنگی نہیں ہے' اس لیے کہ فکر کی سطح پر اس تحریک میں بحث ہی نہیں ہے۔ خرد کی گتھیاں سلجھانے کا وہاں کوئی سوال ہی نہیں ہے' بلکہ حتی الامکان اسے by pass اور صرفِ نظر کرنے کا اہتمام ہوتا ہے۔ اس تحریک کا اصل الاصول یہ ہے کہ ''ایسا کیوں اور کیسے ہے؟'' جیسے سوالات واشکالات کو ذہن سے جھٹک دو اور کام کرو ——— یقیناً اس طرح بھی بے شمار لوگوں کے دلوں میں ایمان پیدا ہوا۔ یہ کام بھی بہت قیمتی ہے۔ اس لیے کہ اگر کسی کو ایمان کی ایک رمق بھی نصیب ہو جائے تو اس کی خوش بختی کا کیا کہنا! ہو سکتا ہے کہ ایمان کی یہ رمق اس کا بیڑا پار لگانے کا سبب بن جائے۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اس تحریک کے ذریعے کثیر تعداد میں لوگوں کی زندگیوں میں تبدیلی آئی ہے۔ کتنی عظیم حرکت ہے جو اس وقت دنیا میں قائم ہے' لیکن اس بات کو اچھی طرح جان لیجئے کہ آج کے دور میں جب تک اس دوسری سطح کا ایمان وجود میں نہیں آئے گا جس میں فکر کی ہم آہنگی بھی موجود ہو' جس میں صرف ''دلِ زندہ'' نہ ہو بلکہ جس میں عقل بھی

روشن ہو اور اس میں صحیح فکر و نظر بھی موجود ہو، جب تک اس سطح پر تجدید ایمان کی ایک مؤثر تحریک بپا نہ ہو، اس وقت تک اس دور میں ہمہ جہتی اسلامی انقلاب وجود میں نہیں آ سکے گا۔ کیونکہ اس دَور میں عقلیت اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے اور عقلیت پرستی تقریباً ایک دین و مذہب کا مقام حاصل کر چکی ہے۔ اب اگر اعلیٰ علمی سطح پر قرآن کے نورِ ہدایت سے عقل و خرد کی گتھیاں سلجھانے کا اہتمام نہیں ہوگا تو وہ ذہین اقلیت (intellectual minority) جو سب سے اوپر بیٹھی ہوئی معاشرے اور نظام حیات کا اصل رُخ متعین کرتی ہے، وہ کبھی متاثر نہیں ہو گی اور معاشرے میں اسلامی نقطہ نظر سے کوئی پائیدار و مستحکم تبدیلی نہیں آئے گی۔ ٹھیک ہے کہ عوامی سطح پر بات پھیلتی چلی جائے گی۔ جیسے ایک بیل زمین پر پھیلتی چلی جاتی ہے، لیکن بات ایک انقلاب آفریں جڑ اور تنے کی صورت اختیار نہیں کر پائے گی۔ یہ ہے وہ دقیق بات جو ایمان کے ضمن میں، میں آج آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا۔ (۶)

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکانِ فلسفہ سے

میں حیران ہوتا ہوں کہ اکثر اوقات کوئی حقیقی شاعر بڑے سادہ الفاظ میں کسی حقیقتِ کُبریٰ کو بڑی عمدگی سے بیان کر دیتا ہے۔ شاید آپ کو معلوم ہو کہ 'شاعر' کا لفظ 'شعور' سے اسم فاعل ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ حقیقی شاعر ہوتا ہی وہی ہے جس میں اعلیٰ سطح کا شعور ہو۔ عرب میں دورِ جاہلیت میں تو عقیدہ یہ تھا کہ ان شاعروں کے تابع کوئی نہ کوئی جن ہوتا ہے جو ان سے ایسی دلآویز اور فصیح و بلیغ شاعری کراتا ہے۔ میرا ذہن جب کبھی بھی مولانا ظفر علی خان کے اس شعر کی طرف منتقل ہوتا ہے جو میں اپنی تقاریر میں اکثر سناتا رہا ہوں، تو میں حیران ہوتا ہوں کہ مولانا مرحوم کس کیفیت میں یہ شعر کہہ گئے۔ شعر میں سادگی اور فصاحت دیکھئے اور پھر غور کیجیے کہ اس میں جامعیت اور بلاغت و معنویت کتنی گھمبیر ہے ؎

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکانِ فلسفہ سے
ڈھونڈھے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآں کے سیپاروں میں

اس شعر میں لفظ 'عاقل' قابلِ غور ہے۔ مولانا مرحوم یہاں یہ لفظ بڑے گہرے شعور اور معنویت

---

(۶) اس موضوع کی تفصیلی تفہیم کے لیے ڈاکٹر صاحب موصوف کی تالیفات (۱) مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق (۲) نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں (۳) اسلام کی نشاۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام —— کا مطالعہ ان شاء اللہ نہایت مفید ہوگا۔ (مرتب)

کے ساتھ لائے ہیں۔ واقعتاً ایک ایمان وہ ہے جو عقل کو by pass کر کے حاصل ہو جاتا ہے۔ وہ صحبت سے مل سکے گا۔ صاحب یقین و ایمان کی صحبت میں آپ بیٹھیں گے تو ایمان آپ کو بھی ملے گا۔ بھٹی کی آگ آپ کو بھی ملے گی' لیکن یہ ایمان عقل اور فکر کی راہ سے نہیں آ رہا' اس میں ذہن و قلب کی ہم آہنگی نہیں ہے۔ جبکہ عالمی فکری و عملی انقلاب کے لیے جو ایمان مطلوب ہے اس میں عقل کی بنیاد موجود ہونی لازمی ہے۔ یہ ایمان دکانِ فلسفہ سے ہرگز نہیں مل سکے گا بلکہ واقعہ اور حقیقت کبریٰ یہی ہے کہ یہ وہ جنس ہے جو ع

ڈھونڈھے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآں کے سپاروں میں!

چودھویں صدی کی دو عظیم شخصیتیں: شیخ الہندؒ اور علامہ اقبال

یہی وجہ ہے کہ میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ اور علامہ اقبال مرحوم کو چودھویں صدی کی دو عظیم مبلّغِ قرآن شخصیتیں سمجھتا ہوں۔ میں نے جس اسلوب سے یہ مسئلہ آپ کے سامنے رکھنے کی کوشش کی ہے' یہ اسلوب و انداز آپ کو نہ شیخ الہند کے ہاں ملے گا اور نہ علامہ کے ہاں — حالانکہ میرا گہرا احساس بلکہ سوچی سمجھی رائے یہ ہے کہ چودھویں صدی کی برصغیر ہندو پاک کی حد تک ہی نہیں بلکہ پورے عالمِ اسلام کے اعتبار سے یہ دونوں محترم شخصیتیں عظیم ترین شخصیتیں ہیں۔ علامہ اقبال کی نابغیت (geniusness) کا لوہا تو اب زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ ہر جگہ مانا جا رہا ہے۔ بعض اہلِ فکر اس رائے کا اظہار کر چکے ہیں کہ مصر میں شاہ فاروق کا تختہ پلٹنے کی تہ میں دوسرے عوامل کے ساتھ مؤثر عامل علامہ اقبال کا پیغام تھا۔ ایران کے موجودہ انقلاب کے متعلق بھی بعض مفکّرین بڑے وثوق سے کہتے ہیں کہ اس انقلاب کا اصل جذبہ علامہ کی فارسی شاعری نے فراہم کیا ہے۔ واللہ اعلم! البتہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جدید دور کے فکر و فلسفہ سے ہم آہنگی کے ساتھ اور اس کی علیٰ وجہ البصیرت تردید کرتے ہوئے عظمت قرآن کے بیان اور اس کی ترجمانی میں علامہ جس بلندی تک پہنچے ہیں' اس میں کوئی ان کا مدمقابل نہیں ہے۔ (۷)

دوسری طرف علماء کے طبقے میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ ہیں۔ وہ مجاہدِ حُریت اور وہ درویش جس کے نام سے انگریز لرزتا تھا اور جسے انگریز حکومت نے جب اسیر کیا ہے تو

---

(۷) اس موضوع پر ان شاء اللہ ڈاکٹر صاحب موصوف کی تالیف ''علامہ اقبال اور ہم'' کا مطالعہ مفید ہوگا۔ (مرتب)

سارا ہندوستان چھوڑ کر مالٹا میں رکھا ہے ــــ گویا۔

اقبالؔ کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو!

تو شیخ الہند کو گرفتار کر کے ہندوستان میں نہیں' مالٹا میں رکھا گیا۔ یہ وہ شخصیت ہیں جو صحیح معنوں میں استاذ العلماء ہیں۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور شیخ الہندؒ کی عظمت و جامعیت: میرا گہرا تاثر' احساس اور پختہ رائے یہ ہے کہ دورِ صحابہؓ' تابعین و تبع تابعین کے بعد عالمِ اسلام میں علمی اعتبار سے تین عظیم ترین شخصیتیں گزری ہیں۔ امام ابن تیمیہ' امام غزالی اور شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہم۔ لیکن ان تینوں کے اندر نسبت یہ ہے کہ شاہ ولی اللہؒ اکیلے مساوی ہیں امام ابن تیمیہؒ اور امام غزالیؒ کے۔ ان دونوں کے کمالات جس شخص کی ذات میں جمع ہوئے ہیں' وہ ہیں شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ۔ عالمِ اسلام کے رجالِ دین میں شاہ صاحبؒ ہی وہ شخصیت ہیں جن میں ایک طرف امام ابن تیمیہؒ کی عقلیت اور سنّت کے ساتھ تمسّک اور دوسری طرف امام غزالیؒ کا تصوف و تفلسف (فلسفہ و منطق) بکمال و تمام موجود ہیں۔

ان کے بعد برصغیر پاک و ہند میں طبقہ علماء میں جو عظیم ترین شخصیت پیدا ہوئی ہے' وہ ہیں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی جامعیت کا اندازہ کرنا ہو تو آپ کو ان کی تصانیف کا مطالعہ کرنا ہوگا' جبکہ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی جامعیت کا اندازہ کرنا ہو تو آپ کو ان کے تلامذہ کو دیکھنا ہوگا۔ ان کے تلامذہ میں ایک طرف تو مجاہدین حریت مولانا حسین احمد مدنی' شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی' اور مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہم ہیں۔ آخر الذکر کے شاگردِ رشید تھے مولانا احمد علی لاہوریؒ جنہوں نے اسی شہر لاہور میں چالیس برس تک ایک مسجد میں مستقل ڈیرا لگا کر قرآن حکیم کا درس دیا ہے۔ دوسری طرف علمی اعتبارات سے مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ اور مولانا انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ علیہما جیسی شخصیات ہیں۔ تیسری طرف مولانا احمد سعید دہلوی' مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی' مولانا محمد میاں رحمۃ اللہ علیہم اور ایسی بے شمار مجاہد صفت علمی شخصیتیں ہیں۔ چوتھی طرف وہ درویش منش' جسم اور جُثّے کے لحاظ سے نحیف و ضعیف لیکن عزم و ہمت اور مجاہدہ کے اعتبار سے کوہ ہمالیہ اور سیماب وش شخصیت ہیں مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ' بانیٔ تبلیغی جماعت۔ پانچویں طرف صاحبِ علم اور صاحبِ تقویٰ شخصیت مولانا

اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی حضرت شیخ الہند کے ساتھ شرف تلمذ حاصل ہے۔ الغرض شیخ الہندؒ کے تلامذہ گرامی میں سے ہر ایک اپنے اپنے مقام پر علم دین و عرفان کا خورشید تھا۔ ایسی تمام شخصیتوں کو جوڑیئے! تو اس کا منبع بنتا ہے۔ شیخ الہندؒ.....! علم قرآن کا میدان ہو' حدیث و فقہ کا میدان ہو' تصوف و سلوک کا میدان ہو' پھر انگریزی سامراج کے خلاف جہاد حریت کا میدان ہو اور قید و بند اور دار و رسن کے مراحل ہوں' ان سب سے یہ مرد خدا آگاہ اور خدا مست گزرا ہے۔

امراضِ اُمتِ مُسلمہ کا واحد علاج: رجوع الی القرآن

چودھویں صدی کی دونوں عظیم شخصیتیں شیخ الہند اور علامہ اقبال (رحمہ اللہ علیہما) اس بات پر متفق تھیں کہ اُمت کے سارے امراض کا علاج ایک ہی ہے کہ اس کو قرآن مجید کی طرف لوٹایا جائے۔ میں نے بڑے وسیع پیمانے پر یہ باتیں پھیلائی ہیں۔

شیخ الہندؒ کی رائے: حضرت شیخ الہندؒ کا وہ قول جو اسارتِ مالٹا سے واپسی کے بعد انہوں نے دارالعلوم دیوبند میں علمائے وقت کے ایک بہت بڑے مجمع میں ارشاد فرمایا تھا' جس کو روایت کیا ہے مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تالیف ''وحدتِ امت'' میں' اس سے پتا چلتا ہے کہ اس شیخ الشیوخ کا دل دردمند حالت اسیری میں امت کے حال پر سوچتا رہا ہے کہ ہمارے ساتھ ذلت و خواری اور فلاکت و محکومی کا معاملہ کیوں ہے؟ غالب کے اس شعر کے مصداق کہ ؎

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں!

اس سوچ بچار اور غور و فکر کا جو جواب حضرت شیخ الہند کو ملا ہے' اس کو انہوں نے اس اجتماعِ علماء میں بایں الفاظ ارشاد فرمایا:

> ''میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس بات پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان' دینی اور دنیوی' ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے: ایک ان کا قرآن چھوڑ دینا' دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی' اس لیے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی' اس کام میں صرف کر دوں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے۔ بچوں کے لیے لفظی تعلیم کے مکاتب بستی بستی میں قائم کیے جائیں' بڑوں کو عوامی درسِ قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے' اور مسلمانوں کے باہمی

جنگ وجدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔''

شیخ الہندؒ کے اس قول کے متعلق مولانا مفتی محمد شفیعؒ نے اپنی تالیف میں اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ حضرتؒ نے جو یہ دو باتیں فرمائیں' غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اصل میں یہ دو نہیں بلکہ ایک ہی ہیں۔ اس لیے کہ ہمارے آپس کے اختلافات' خانہ جنگی اور تفرقے کا اصل سبب بھی قرآن مجید سے دور ہو جانا ہی ہے —— دیکھئے' وحدتِ ملی کی اساس قرآن حکیم ہی ہے: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ص﴾ (آلِ عمران:۱۰۳) ''اللہ کی رسّی کو مل جل کر مضبوطی سے تھام لو اور تفرقے میں نہ پڑو''۔ وعظ کہہ دینا آسان ہے کہ اتحاد ہونا چاہیے۔ سوال یہ ہے کہ اتحاد کس اساس پر ہو؟ ہر تعمیر کے لیے بنیاد درکار ہوتی ہے اور وحدتِ ملّی کے لیے اصل بنیاد قرآن حکیم ہے۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ ہماری ذلت وپستی کی جڑ اور بنیاد ایک ہی ہے اور وہ ہے قرآن مجید' فرقانِ حمید' شِفَاءٌ لِّلنَّاس سے بعد اور دوری' اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

علامہ اقبال کی رائے: دوسری طرف' جو کچھ اس بارے میں علامہ اقبال مرحوم نے کہا ہے' اس کا بار بار تذکرہ ہو چکا ہے۔ میں اس وقت اس کا اعادہ نہیں کروں گا' صرف دو شعر آپ کو سنا کر آگے چلتا ہوں:۔

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی
شکوہ سنج گردشِ دوراں شدی
اے چوں شبنم بر زمین افتندۂ
در بغل داری کتابِ زندۂ

یعنی تمہارے تمام دکھوں اور مصیبتوں کا علاج تمہاری بغل میں موجود ہے' تم کہاں در در کی ٹھوکریں کھا رہے ہو اور کہاں کہاں تم نے دستِ سوال دراز کر رکھا ہے! کہیں نظریات کی بھیک مانگ رہے ہو' کہیں نظامِ سیاست وحکومت کی بھیک مانگ رہے ہو' کہیں معاشرت ومعیشت کے اصولوں کی بھیک مانگ رہے ہو' کہیں اسلحہ کی بھیک مانگ رہے ہو' کہیں اقتصادی امداد کا کشکول ہاتھ میں لے کر در در کی ٹھوکریں کھا رہے ہو۔ ملوک وسلاطین اور صدور واُمراء کے آگے ہاتھ پھیلا رہے ہو' حالانکہ تمہاری اصل دولت اور تمہاری تمام بیماریوں کا علاج تمہاری اپنی بغل میں موجود ہے ع ''در بغل داری کتاب زندۂ!'' اور وہ ہے قرآنِ مجید' فرقانِ حمید۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب.....

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کریں کیا؟ اس قرآن حکیم کا اذہان وقلوب میں نفوذ کیسے ہو؟ میں پھر عرض کر رہا ہوں کہ صرف قرآن کا علم کافی نہیں ہوگا۔ اگرچہ اس کی اپنی جگہ بڑی اہمیت ہے اور اس کی بھی بڑی تاثیر ہے۔ میں تو یہ بھی مانتا ہوں کہ اگر کہیں صرف صحیح پڑھنے والا شخص قرآن پڑھ رہا ہو تو قرآن کا جو اپنا ایک ملکوتی غنا ہے' اس کی اپنی جو ملکوتی موسیقی ہے' پڑھنے والا صرف اسے بروئے کار لا سکے تو اس میں بھی بڑی تاثیر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ چاہے' نہ پڑھنے والا سمجھ رہا ہو اور نہ سننے والا کہ کیا کہا جا رہا ہے' پھر بھی اس میں تاثیر ہے' اس لیے کہ یہ مالک ارض وسما کا کلام ہے اور اس کا ایک ملکوتی صوتی اثر (Divine sound effect) ہے۔ انسان کی روح اس ملکوتی کلام کے اثرات سے ہم آہنگ ہے۔ اس سے آگے یہ ہے کہ انسان قرآنِ مجید کی ناظرہ تلاوت کر رہا ہو' ترجمہ سے استفادہ کر رہا ہو' یہ عمل بھی متاثر کرے گا۔ لیکن ایک عمل ہے ذہن وفکر اور عقل وشعور کے ذریعے قرآن حکیم کو قلوب میں اُتارنا۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشّاف

علامہ اقبال نے بڑی پیاری بات ایک اور شعر میں کہی ہے کہ ؎

تو عرب ہو یا عجم ہو تیرا لَا اِلٰہ اِلاّ
لغتِ غریب' جب تک تیرا دل نہ دے گواہی!

عالَمِ عرب کی زبان عربی ہے' اس حقیقت سے کون واقف نہیں۔ لیکن کیا اس وقت ان میں باطل نظریات موجود نہیں ہیں؟ کیوں موجود ہیں؟ —— قرآن مجید عربی زبان میں ہے جو ان کی مادری زبان ہے۔ وہ تو اس کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ دقت تو ہمارے سمجھنے میں پیش آتی ہے' کیونکہ عربی ہماری مادری زبان نہیں ہے —— اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ باطل نظریات اور باطل فلسفوں کا ایک غلاف اور ایک خول ہے جو ذہنوں پر چڑھا ہوا ہے۔ یہ فضا میں معلق گردوغبار (dust suspension) ہے جسے ہر شخص inhale کر رہا ہے اور ان باطل نظریات کی غبار آلود فضا میں سانس لے رہا ہے اور نتیجتاً یہ نظریات ہمارے اذہان میں' ہمارے فکر میں اور ہمارے قلوب میں سرایت کرتے رہتے ہیں اور ان کا جزو بنتے رہتے ہیں۔ اس سے ہماری اقدار (value) متعین ہوتی ہیں اور اس غبار نے ہمارے دلوں پر اسی طرح کا حجاب ڈال

دیا ہے جیسے یہودی نبی اکرم ﷺ سے استہزاءً کہا کرتے تھے: ''قُلُوْبُنَا غُلْفٌ'' اے محمدؐ! آپ ہم پر کتنی ہی تبلیغ کر لیں، ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں، وہ بڑے محفوظ ہیں، ان پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔

اسی طرح اس بات کو سمجھ لیجئے کہ دراصل انسان کے فکر اور ارادے پر باطل نظریات کے غلاف پڑ چکے ہوں۔ جب تک ان غلافوں کو پھاڑ نہیں دیا جائے گا، جب تک ان کا پردہ چاک نہیں ہوگا، جب تک ان کی مرعوبیت، جو اذہان پر مستولی ہے، وہ ختم نہیں ہوگی، قرآن مجید اندر نہیں اترے گا — اور جب تک اندر نہیں اترے گا، کوئی حقیقی تبدیلی نہیں آئے گی۔ اس بات کو مثبت انداز میں علامہ اقبال نے یوں کہا ہے ؎

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

یہاں علامہ نے ''جان کے اندر'' کہا ہے، جبکہ اردو شعر میں ''ضمیر'' کہا تھا ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی، نہ صاحبِ کشّاف

ضمیر باطن اور چھپی ہوئی حقیقت کو کہتے ہیں۔ جان بھی باطن کے حقائق کی ایک تعبیر ہے۔ ہماری عقل، ہمارا فکر، ہمارا قلب اور ہماری روح مخفی حقیقتیں ہیں، یہی اصلاً جان ہے۔ وہاں تک اگر قرآن حکیم کی حکمت اور اس کے فطری استدلال کی رسائی نہ ہوئی تو ؎

خرد نے کہہ بھی دیا لا اِلٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں!

اس تمام گفتگو کا حاصل یہ نکلا کہ فرد کی اصلاح کا معاملہ ہو یا پورے معاشرے کی اصلاح کا سوال ہو تو اس کے لیے اصل ضرورت ہے ایمان — اور ایمان کا سرچشمہ اور منبع ہے قرآن مجید۔ پھر قرآن کی صرف تعلیم و تدریس ہی نہیں، بلکہ اس کے حکم اور اس کے فطری و بدیہی استدلال کا اذہان سے قلوب میں نفوذ ضروری ہے۔ ایسا نفوذ کہ اس کی حقانیت پر فکر و نظر اور عقل و شعور مطمئن ہوں اور ان ذرائع سے یہ اطمینان قلب و روح میں اُتر جائے۔ پھر دل گواہی دے کہ یہ قرآن حق ہے اور قلب و نظر کی کیفیات یہ ہو جائیں کہ:

﴿فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ﴾ (البقرۃ:۲۶)

''تو جو لوگ صاحبِ ایمان ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ یقیناً حق ہے اُن کے ربّ کی طرف سے۔''

اور

﴿وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ﴾(بنی اسرائیل:۱۰۵)

''اور اس (قرآن) کو ہم نے حق کے ساتھ نازل کیا ہے اور یہ حق کے ساتھ نازل ہوا ہے۔''

اذہان وقلوب میں قرآن مجید کا نفوذ کیسے ہو؟

اب سوال یہ ہے کہ اذہان وقلوب میں قرآن مجید کے نفوذ کے لیے کیا اہتمام کیا جائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کام کو دو سطحوں پر انجام دیا جا سکتا ہے: پہلی سطح محدود اور دوسری سطح وسیع ترین ہے۔ محدود سطح یہ ہے کہ رجالِ دین' دینی ادارے اور انجمنیں عوامی درس کی صورت میں ـــــ عوامی درس کی اصطلاح میں نے حضرت شیخ الہندؒ کے قول سے اخذ کی ہے جو قبل ازیں میں آپ کو سنا چکا ہوں ـــــ عوامی سطح پر قرآن حکیم کے انقلابی دعوت و پیغام کو عام کریں۔ پھر ان دروس کے لیے فلسفہ و منطق کے اسلوب کے بجائے قرآن ہی کے طرزِ استدلال کو اختیار کریں جو عقل و شعور کے ساتھ ساتھ فطرتِ انسانی اور بدیہیاتِ انسانی کو اپیل کرتا ہے۔

اسی طرح اجتماعاتِ جمعہ میں نبی اکرم ﷺ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے تذکیر بالقرآن کریں' اس لیے کہ حضور ﷺ خطبہ جمعہ میں قرآن کریم کی تلاوت کیا کرتے تھے اور اس کے ذریعے لوگوں کو تذکیر کرایا کرتے تھے۔ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

كَانَتْ لِلنَّبِيِّ ﷺ خُطْبَتَانِ يَجْلِسُ بَيْنَهُمَا يَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ وَيُذَكِّرُ النَّاسَ. (۸)

''رسول اللہ ﷺ (نمازِ جمعہ سے پہلے) دو خطبے دیا کرتے تھے' ان دونوں کے درمیان بیٹھا کرتے تھے' اور (ان خطبوں میں) قرآن کریم کی تلاوت اور لوگوں کی تذکیر فرمایا کرتے تھے۔''

چنانچہ خطبۂ جمعہ سے قبل تقاریر کا جو سلسلہ جاری ہے یا جو حضرات اردو یا مقامی زبان میں خطبہ جمعہ دیتے ہیں' وہ اسی عمل پر دوام اختیار کریں جو نبی اکرم ﷺ کا اساسی منہج ہے: ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾(الجمعة:۲) ''جو تلاوت کر کے انہیں سناتا ہے اس کی آیات اور انہیں پاک کرتا ہے اور تعلیم دیتا ہے انہیں کتاب و حکمت کی''۔ یہ انقلابِ

(۸) صحيح مسلم' كتاب الجمعة' باب ذكر الخطبتين قبل الصلاة وما فيهما من الجلسة۔

نبویؐ کے اساسی منہج کے چار عناصر ہیں: تلاوتِ آیات' تزکیہ اور تعلیم کتاب وحکمت۔

یہ تو محدود سطح ہے کہ عوامی درس اور خطبہ جمعہ کے ذریعے لوگوں کے اذہان وقلوب میں قرآن کا نفوذ کیا جائے' جبکہ اس کی ایک وسیع ترین سطح بھی ہے اور یہ کام حکومت کے کرنے کا ہے۔ تعمیرِ سیرت وکردار کے لیے حکومتی سطح پر کرنے کے جو کام ہو سکتے ہیں' میں نے پچھلی تقریر میں بھی ان کا اجمالاً ذکر کیا تھا' لیکن آج ان کاموں کا تفصیلاً تجزیہ کر کے آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

حکومتی سطح پر اصلاحِ معاشرہ کے مؤثر ترین ذرائع

کسی چیز کو وسیع ترین اور بڑے پیمانے پر کسی معاشرے کے افراد کے قلوب واَذہان میں اُتارنے کے لیے حکومتی سطح پر تین بڑے مؤثر ذرائع ہیں۔ پہلا ذریعہ ہے پریس' دوسرا ذریعہ ہے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذرائع ابلاغ —— پریس بھی ایک ذریعہ ابلاغ ہے' لیکن اس کو میں نے علیحدہ اس لیے رکھا ہے کہ اس کو حکومت کی گرفت سے آزاد بھی کہا جا سکتا ہے' اس لیے کہ یہ پبلک سیکٹر میں بھی ہے اور لوگ بڑی حد تک اس کو اپنی سوچ اور اپنی فکر کی نشر واشاعت کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ جبکہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن دونوں سراسر اور بالکلیہ حکومت کے ہاتھ میں ہیں ☆۔ یورپ اور خاص طور پر امریکہ میں یہ ادارے بظاہر آزاد ہیں۔ میں نے 'بظاہر' اس لیے کہا کہ درحقیقت یہ وہاں بھی آزاد نہیں ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان پر تسلّط حکومت کا نہیں' سرمایہ دار کا ہے۔ وہاں یہ ذرائع ابلاغ سرمایہ دار کی گرفت میں ہیں۔ عام آدمی وہاں بھی اسی طرح ان کی زد میں رہتا ہے جس طرح حکومت کے ہاتھ میں یہ ذرائع ہونے کی صورت میں رہتا ہے۔ وہاں بھی عوام الناس کی آزادانہ سوچ اور فکر پروان نہیں چڑھ سکتی اور سرمایہ دار اپنے مفادات کے مطابق ان ذرائع ابلاغ کا استحصال کرتا ہے۔ پھر یہ بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ یورپ اور خاص طور پر امریکہ میں سب سے اوپر یہودی سرمایہ دار ہیں جو اپنی سرمایہ داری کے بل بوتے پر ذرائع ابلاغ پر بھی مسلط ہیں اور نہایت حقیر اقلیت ہونے کے باوجود ایوانِ حکومت میں بھی یہود ہی کی پالیسیاں اثر انداز بلکہ نافذ العمل ہوتی ہیں۔ علامہ اقبال نے تو آج سے تقریباً پچاس ساٹھ سال قبل ہی اس حقیقت کا ادراک کر لیا تھا کہ ع ''فرنگ کی رگِ جاں پنجہ یہود میں ہے''۔ آج یورپ بالخصوص امریکہ میں یہی صورتِ حال فی الواقع موجود

☆ واضح رہے کہ یہ خطاب ۱۹۸۲ء کا ہے جب ٹیلی ویژن سے مراد صرف ''پی ٹی وی'' تھا۔

ہے۔ اس گرفت کے عوامل میں ایک طرف ان یہود کی سرمایہ داری ہے اور دوسری طرف اپنے سرمایہ کے بل پر ان تمام ممالک کے ذرائع ابلاغ: پریس، ریڈیو، ٹیلی ویژن، حتیٰ کہ فلم انڈسٹری پر ان یہود کا تسلط ہے۔ بہرحال ہمارے ہاں تو ریڈیو، ٹیلی ویژن پر کامل تسلط حکومت کا ہے اور اس میں کسی نجی (private) ادارے کا عمل دخل نہیں ہے۔ چنانچہ پہلا ذریعہ ہوگیا پریس، دوسرا ریڈیو اور ٹیلی ویژن، جبکہ تیسرا ذریعہ ہے نظامِ تعلیم —— اب میں چاہوں گا کہ ان میں سے ایک ایک کے حلقہ اثر اور نفوذ کا جائزہ لیا جائے۔

پہلا ذریعہ: پریس اور صحافت

پریس کا معاملہ یہ ہے کہ اگرچہ اس کا ایک حصہ تو وہ ہے جو ''پریس ٹرسٹ'' کے ذریعے سے حکومت کے زیر اثر ہے، لیکن اس وقت میں آزاد پریس کی بات کروں گا۔ اس میں دو بیماریاں اس طرح جڑ پکڑ چکی ہیں کہ اس نے صحت مند صحافت کا دور ختم کر کے رکھ دیا ہے۔ کچھ عرصہ قبل پریس کے ذریعے صاحبِ فکر لوگ اپنا تعمیری فکر عوام کے اذہان میں منتقل کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ ماضی قریب میں ایسے بہت سے اہلِ فکر و نظر بزرگ گزرے ہیں جنہوں نے اعلیٰ پیمانے پر یہ خدمت انجام دی ہے۔ ان میں سے چند بزرگوں کے نام اس وقت ذہن میں آ رہے ہیں، جیسے ضیغم حق، مردِ حُر مولانا ظفر علی خاںؒ کی صحافت، بطل حریت مولانا محمد علی جوہرؒ کی صحافت، الہلال اور البلاغ کے دور کے ضیغم حق مولانا ابوالکلام آزادؒ کی صحافت کہ جس کے ذریعے اس دور میں دعوت رجوع الی القرآن اور پیغامِ جہاد کا غلغلہ بلند ہوا۔ اسی طرح خود مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ جو موجودہ دور کے ایک عظیم مفکرِ اسلام ہیں اور جنہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی دعوت کو ایک عظیم تحریک کی شکل میں برپا کیا۔ مولانا مودودی خود بنیادی طور پر صحافی تھے، انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز بطور صحافی کیا تھا۔ بالکل نوعمری کے دور میں وہ ''تاج'' آگرہ اور بعدہٗ چند سال تک جمعیت العلماء ہند کے ترجمان ''الجمعیت'' دہلی کے مدیر رہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہاں سے علیحدہ ہونے کے بعد مولانا مرحوم کسی روزنامے یا ہفت روزہ سے وابستہ نہیں رہے اور بقیہ ساری عمر وہ اپنا ماہنامہ (ترجمان القرآن) ہی نکالتے رہے۔ مولانا مرحوم خود اپنے آپ کو بنیادی طور پر ''صحافی'' ہی قرار دیتے تھے۔ مجھے ایک معتبر صاحب نے کبھی بتایا تھا کہ پاسپورٹ کے فارم میں ذریعہ معاش کے کالم میں مولانا نے ''صحافت'' درج کیا تھا۔ یہ صحافت تعمیری اور بامقصد صحافت تھی، اس میں درویشی

پائی جاتی تھی اور اس کا بنیادی نقطۂ نظر یہ تھا کہ معاشرہ کو صالح فکری غذا پہنچائی جائے۔

آج کی صحافت کا معاملہ یہ ہے — اور یہ بات مسلّمہ طور پر مانی بھی جاتی ہے — کہ اب یہ ایک انڈسٹری بن چکی ہے۔ یہ درحقیقت حصولِ منفعت اور طلب منفعت کا ایک ذریعہ ہے۔ جیسے ایک کارخانہ ہے' اس میں سرمایہ لگانے والوں کو اپنے منافع سے اور اس میں کام کرنے والوں کو اپنے معاوضے سے غرض ہوتی ہے۔ اسی طریقہ سے صحافت فی الوقت بنیادی طور پر ایک انڈسٹری بن گئی ہے۔ پھر یہ کہ اب کچھ زوردار باطل نظریات بھی آ چکے ہیں' جن کی گرفت ہمارے اکثر و بیشتر صحافیوں کے اَذہان پر بڑی مضبوط ہے۔ مالکان کا عموماً حال یہ ہے کہ جیسے کبھی ''ادب برائے ادب'' کا نقطۂ نظر تھا' اب ان مالکان کا نقطۂ نظر ''صحافت برائے صحافت'' ہے۔ ان کو تو اپنی ذاتی منفعت سے غرض ہے۔ ان کی طرف سے بھاڑ میں جائے اصلاحِ معاشرہ۔ معاشرے میں جس چیز کی مانگ ہے' ان کا فلسفہ یہ ہے کہ اس مانگ کو اور بڑھاؤ' خوب غذا دو' اس میں مسابقت کرو' یہی چیز ان کے لیے سونے کی کان ثابت ہوگی۔

اب رہا صحافیوں کا معاملہ! تو اس کو سمجھنے کے لیے آپ کو نصف صدی پیچھے کی طرف لوٹنا ہوگا' جب برصغیر پاک و ہند میں ''ادب برائے زندگی'' کا نظریہ بڑے زور و شور سے آندھی کی مانند اٹھا تھا اور ''ترقی پسند ادب'' کے نام سے عریانی' فحاشی' لذت پسندی کے شکر آمیز (sugar coated) ادب کے ذریعے مادّہ پرستی' الحاد' اباحیت اور اشتراکیت ہمارے پڑھے لکھے طبقے میں اتارنے کی بڑی منظّم مہم شروع کی گئی تھی۔ اس ترقی پسند ادب کے علمبرداروں کا فلسفہ یہ ہے کہ ادب کے ذریعے وعظ کہنا بالکل غلط ہے۔ ادب تو ایک آئینہ کی مانند ہوتا ہے اور آئینہ اصل حقیقت کی عکاسی کرتا ہے' لہٰذا ادب کو معاشرے کے حقیقی خدوخال کا عکاس ہونا چاہیے۔ گویا ان کے نزدیک گندے کپڑوں کی برسرِعام نمائش ہی ادب کی معراج ہے۔ چنانچہ اس فلسفہ کے تحت ادب اور صحافت کے نام پر افسانوں اور ڈراموں کے ذریعے عریانی و فحاشی کا جو سیلاب آیا ہے' وہ رکا نہیں ہے۔ البتہ مصلحت بینی کی خاطر مختلف روپ اور بھیس بدلتا رہا ہے اور کسی نہ کسی بھیس میں آج بھی ہماری دینی' اخلاقی' معاشرتی اقدار و روایات کو دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے اور سرطان کی طرح جسدِ ملّی پر مسلّط ہے۔ الغرض آج ہماری صحافت کا بالعموم مطمحِ نظر یہ ہے کہ معاشرے میں فی الواقع جو کچھ ہے' ہمیں تو بس اس کی عکاسی کرنی ہے۔ اس کے معاشرے پر مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں یا منفی' اس سے ہمیں کوئی غرض نہیں۔

اب سوچیے کہ جب صحافت انڈسٹری بھی بن گئی ہو اور صحافت کا نظریہ بھی یہ ہو کہ جو کچھ معاشرے میں ہے ہمیں اسی کی عکاسی کرنی ہے' ہمیں کوئی وعظ نہیں کہنا' کسی اصلاح کا کوئی نظریہ اپنی طرف سے لوگوں کے ذہنوں میں نہیں اُنڈیلنا تو بالآخر اس کا نتیجہ پھر یہی ہے کہ جس چیز کی مارکیٹ میں ڈیمانڈ ہے وہی آپ کو پیش (produce) کرنی ہوگی' بلکہ باقاعدہ شیطانی چکّر (vicious circle) کے ذریعے اس کی ڈیمانڈ پیدا کی جائے گی —— جیسے ہر انڈسٹری کے لیے یہ کام ناگزیر ہوتا ہے کہ اپنے آئٹم کی ڈیمانڈ کے لوازم پورے کیے جائیں' مارکیٹ کے رجحان پر نظر رکھی جائے' اسی طرح صحافت میں بھی یہ اصول کارفرما ہے۔ چنانچہ اس تمام دوڑ دھوپ کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ڈیمانڈ میں روز بروز اضافہ ہوتا ہے اور یہ فعل مسلسل اور دوطرفہ جاری رہتا ہے۔ ہوس کی تو کوئی حد نہیں ہوتی' چاہے وہ مال کی ہو' چاہے لذت کوشی کی ہو۔ اسی طرح منافع خوری کی بھوک بھی بڑھتی رہتی ہے اور لذت کوشی کی ہوس بھی۔

یہ ہے صحیح صورتِ حال اور اصل وطیرہ جو ہماری موجودہ صحافت میں نمایاں نظر آ رہا ہے اور پورے ملک کی صحافت میں اس سچ کو لوگ محفوظ ہیں' ان کی حیثیت ایک بحرِ بیکراں کے مقابلے میں ایک چھوٹی سی آب جو سے بھی فروتر ہے۔ آپ سوچیے کہ اس صحافت کے ذریعے ذہنوں اور دلوں میں قرآن کہاں اتر سکتا ہے؟ یہ ضرور ہوتا ہے کہ ایک مستقل کالم قرآن مجید کے ترجمے یا کسی دینی موضوع کے لیے مخصوص کیا جاتا ہے' یا ادارتی صفحہ کی لوح پر کسی آیت یا حدیث کا ترجمہ ضرور درج ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ ہفتہ وار ایڈیشن میں مذہبی موضوعات کے لیے چند صفحات بھی مخصوص ہوتے ہیں۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ موجودہ صحافت کی جو موجِ رواں (main current) ہے' اس میں کسی درجے میں بھی صحافت کے ذریعے قرآن حکیم کا نفوذ' دینی اقدار کا فروغ' دینی تعلیم و تدریس اور تربیت' دینی لحاظ سے معاشرے کے اذہان و قلوب کی اصلاح کا نظریہ و مقصد' تقریباً معدوم کے درجے میں ہے۔ بلکہ اصل کام اس کے بالکل برعکس اور بر خلاف بڑی اعلیٰ تکنیک کے ساتھ جاری و ساری ہے اور اس میدان میں آزاد پریس اور حکومت کے ''پریس ٹرسٹ'' کے اخبارات و جرائد میں مسابقت کی ایک دوڑ لگی ہوئی ہے۔

دوسرا ذریعہ: ریڈیو اور ٹیلی ویژن

رہا ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا معاملہ! تو یہ دونوں ذرائع ابلاغ براہِ راست حکومت کے کنٹرول میں ہیں۔ ان کا معاملہ پریس سے قدرے مختلف ہے۔ اس ضمن میں حکومت کی اپنی

مصلحتیں ہیں اور مجبوریاں بھی۔ مصلحتیں تو یہ ہیں کہ معاشرے میں تفریح کا جو رجحان انتہا تک پہنچایا جا چکا ہے' اس کی رعایت ضروری ہے۔ تفریحات میں قوم وملت کو اس طرح محو رکھو کہ سنجیدہ مسائل پر دھیان دینے اور غور وفکر کرنے کا اسے موقع ہی نہ ملے۔ اس معاملے میں پریس اور ان ذرائع ابلاغ میں کمیت کا تو فرق ہو سکتا ہے' کیفیت کا نہیں۔ پھر حکومت کو اپنے کاموں کے تعارف اور پروپیگنڈے کے لیے بھی ان کو استعمال کرنا ہوتا ہے۔ سرکاری و نیم سرکاری تقاریب' غیر ملکی اہم شخصیتوں کی پاکستان میں آمد و رفت' ان کے استقبال اور وداع' نیز پاکستان میں ان کی مصروفیات کو coverage دینی ہوتی ہے۔

اس حوالے سے حکومت کی مجبوریاں یہ ہیں کہ اگر ان ذرائع سے فی الواقع کوئی فکر پھیلانے کی منصوبہ بندی کی جائے تو ملک میں جو فقہی یا نظریاتی مسالک اور فرقے ہیں' ان سب کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ دینی پروگرام ان مسالک اور فرقوں میں حصہ رسدی کے اعتبار سے تقسیم نہ کیے جائیں تو حکومت کو ہدفِ ملامت بننا پڑتا ہے' اس کی ساکھ کو صدمہ پہنچتا ہے۔ لہٰذا ہوتا یہ ہے کہ اس بات کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ اتنے دیوبندی علماء آئیں تو اتنے بریلوی آنے چاہئیں اور اگر اتنے سنی آئے ہیں تو اتنے شیعہ حضرات آنے چاہئیں' ورنہ ایک عدم توازن پیدا ہو جائے گا۔ چنانچہ ہمارے ہاں ان ذرائع ابلاغ سے جو کھچڑی پیش کی جاتی ہے اس سے ہمارے ہاں پہلے سے موجود فکری انتشار (confusion of ideas) میں مزید اضافہ ہو رہا ہے اور یہ صورتِ حال ان انتشارات کو دوام بخشنے اور مزید گاڑھا کرنے کا سبب بن رہی ہے۔ چنانچہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر ایسا کوئی منصوبہ نظر نہیں آتا کہ جس کے ذریعے قرآن کی اصل دعوت اور اس کے حقیقی پیغام (message) کو لوگوں تک پہنچایا جا رہا ہو اور اسے قلوب و اذہان میں راسخ کیا جا رہا ہو۔ گویا ''چوں بجاں در رفت'' والا معاملہ یہاں نظر نہیں آتا۔ میں یہ بات تنقیداً عرض نہیں کر رہا' بلکہ اس معاملہ میں حکومت کو واقعی مجبوریوں سے بھی سابقہ پیش آتا ہے۔ ''رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند'' والا معاملہ ہے۔ انہوں نے از خود اپنے قدموں میں بیڑیاں ڈال رکھی ہیں۔ میں صحیح صورت حال کا تجزیہ کر کے آپ کے سامنے لا رہا ہوں تاکہ آپ کو معلوم ہو کہ اصل میں حقیقت ہے کیا.....!!

تیسرا ذریعہ: نظامِ تعلیم اور نصابِ تعلیم

نظامِ تعلیم کی طرف آئیے تو معاملہ اور بھی دگرگوں ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ

اس پر نوکر شاہی کی آمریت مسلط ہے جو نظامِ تعلیم میں کسی طور بھی کوئی بامقصد اور تعمیری تبدیلی کو کسی حال میں گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ بیوروکریسی میں کچھ اللہ کے بندے کوئی تبدیلی اگر چاہتے بھی ہوں تو وہ انتہائی اقلیت میں ہونے کی وجہ سے بالکل بے اثر ہیں۔ اس کی تازہ ترین مثال میں آپ کے سامنے رکھتا ہوں کہ موجودہ حکومت کتنے عرصے قبل اس فیصلے کا اعلان کر چکی ہے کہ خواتین کی علیحدہ یونیورسٹیاں بنائی جائیں گی' لیکن اس کی طرف ساڑھے پانچ سال کے عرصے میں ''مارشل لاء حکومت'' کے باوصف ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا(۹)۔ جس طرح اس حکومت سے قبل یونیورسٹیوں میں مخلوط تعلیم جاری تھی' آج بھی جاری ہے اور کوئی آثار نظر نہیں آتے کہ اس کی طرف پیش قدمی تو درکنار کوئی منصوبہ بندی بھی ہوئی ہو۔ پھر اس عرصے کے دوران خواتین کے لیے علیحدہ کسی نوع کے ایک کالج کا قیام بھی میرے علم کی حد تک تا حال عمل میں نہیں آیا۔ اس حکومت سے قبل جو خواتین کالج پہلے سے موجود تھے' وہی برقرار ہیں۔ میں ایک اعتبار سے اسے بھی غنیمت سمجھتا ہوں' کیونکہ جس نظریات کی حامل نوکر شاہی کی آمریت اس ملک پر مسلط ہے' اس سے بعید نہیں کہ خواتین کے الگ کالجز بھی اس کی آنکھ میں کانٹے کی طرح کھٹک رہے ہوں اور وہ ان کا وجود مجبوراً گوارا کر رہے ہوں۔

غور کیجئے کہ خواتین کی یونیورسٹی کے قیام ہی میں نہیں بلکہ منصوبہ بندی تک میں رکاوٹ کون بنا ہوا ہے —— موجودہ حکومت کے نظامِ تعلیم میں بہت اعلیٰ آفیسرز میں سے ایک صاحب کا' جن کو بلاشبہ اس نظامِ تعلیم کے ایک اہم ستون کی حیثیت حاصل ہے' یہ جملہ نہایت معتبر ذریعے سے میرے گناہگار کانوں تک پہنچا ہے کہ ''اگر لڑکیوں اور لڑکوں کی یونیورسٹیاں علیحدہ علیحدہ بنا دی گئیں تو لڑکوں کی یونیورسٹیاں تو لڑکیوں کے بغیر اس باغ کے مانند ہوں گی جس میں تتلیاں ہی نہ ہوں اور وہ باغ ہی کیا جس میں تتلیاں نہ ہوں!'' محکمہ تعلیم میں اعلیٰ عہدوں پر فائز لوگوں کا نقطہ نظر اور اقدار یہ ہوں تو کیا خواتین کی علیحدہ یونیورسٹیوں کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے؟

ہمارے نصابِ تعلیم کی زبوں حالی

ایک اور اہم تر اور قابلِ غور بات یہ ہے کہ نظام اور ذریعہ تعلیم تو طلبہ کو ''علم'' منتقل کرنے

(۹) ڈاکٹر صاحب کا یہ خطاب ۱۹۸۲ء کا ہے' جبکہ آج قریباً پینتیس (۳۵) سال مزید گزرنے کے باوجود بھی خواتین کی الگ یونیورسٹیز قائم نہیں کی گئیں۔ (مرتب)

کا نام ہے' لیکن سوال یہ ہے کہ وہ نصابِ تعلیم بھی موجود ہے یا نہیں جسے پہنچانا درکار ہے' جو طلبہ و طالبات کو ایک مؤمن کا ذہن و شعور دے سکے! مجھے افسوس اور دکھ کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ ایسا نصابِ تعلیم جس میں ہمارا دین رچا بسا اور سمویا ہوا ہو' سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ نظامِ تعلیم سے لے کر نصابِ تعلیم تک' ہمارا سارے کا سارا معاملہ مغرب کی خدا نا آشنا درس گاہوں سے مستعار لیا ہوا ہے۔ ہمارے پاس تو جڑ اور بنیاد ہی اس وقت موجود نہیں ہے۔ یہ بات چھوڑ دیجئے کہ دینیات اور اسلامیات کا پیریڈ بھی اسکول یا کالجوں میں بطور ضمیمہ (appendix) شامل ہے یا اُردو کی درسی کتب میں چند مضامین دینی و اخلاقی تعلیم کے بھی شامل ہیں یا یہ کہ ہمارے ہاں ''اسلامیات'' کی تعلیم کا بھی ایم اے تک انتظام ہے۔ دیکھنا یہ ہوگا کہ نصابِ تعلیم کا بحیثیت مجموعی مزاج کیا ہے۔ وہ غیر محسوس طریقے سے کس نظریے' خیال اور عقیدے کو متعلّمین کے ذہنوں میں اتارتا اور hammer کرتا ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ ہمارا سارا ''علم'' تو یورپ و امریکہ سے مستعار لیا ہوا ہے' لہٰذا مجھے کوئی بتائے کہ کیا اس علم میں ''توحید'' کا اثبات ہے؟ نبوت و رسالت' وحی اور انزالِ کُتبِ الٰہیہ کا اثبات ہے؟ بعث بعد الموت کا اثبات ہے؟ حشر و نشر' جزا و سزا اور جنت و دوزخ کا اثبات ہے؟ وہاں تو الحاد' مادہ پرستی اور دہریت ہے اور اس رائج الوقت علم کا حال تو بقول علامہ اقبال یہ ہے کہ ؎

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ!

یہی بات اکبر الٰہ آبادی نے طنزیہ و مزاحیہ انداز سے یوں بیان کی ہے کہ ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی!

اگر ہمارے ہاں نصابِ تعلیم ایسا رائج ہو جس میں سائنٹیفک طریقے سے علم الحقائق یعنی قرآن حکیم سمویا ہوا ہو تو دیکھتے ہی دیکھتے ہماری نئی نسلوں کے اذہان میں عظیم تبدیلی آ سکتی ہے' حتیٰ کہ خود سائنس کی کتابیں اگر قرآنِ حکیم کی روشنی اور تعلیم کے پیشِ نظر مرتب کی جائیں گی تو اس سے خود بخود ذہنی و فکری سطح پر ایک عظیم انقلاب برپا ہو جائے گا' الحاد و دہریت اور مادہ پرستی کے اندھیارے چھٹ جائیں گے۔ اگر یہ بات سائنٹیفک طریقے سے قرآن کے استدلال کے

مطابق آئے کہ یہ کائنات ایک اللہ کی بنائی ہوئی ہے اور جن طبعی (physical) قوانین کے تحت یہ رواں دواں ہے' وہ اُسی کے بنائے ہوئے قوانین ہیں: ﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ﴾ (الاعراف:٥٤) ''آگاہ ہو جاؤ اُسی کے لیے خلق بھی ہے اور امر بھی!'' اور وہ ہر آن اس کی نگرانی اور تدبیر کر رہا ہے: ﴿يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ﴾ (السجدۃ:٥) ''وہ تدبیر کرتا ہے اپنے امر کی آسمان سے زمین کی طرف''..... سائنس کا طالب علم جب ابتدا سے اس ذہن کے ساتھ فزکس' کیمسٹری' بیالوجی اور جیالوجی کو پڑھے گا تو اس کا نقطۂ نظر خالص دینی ہوتا چلا جائے گا۔ لیکن اگر ابتدا ہی سے تصور یہ دیا جائے کہ کچھ پتا نہیں اس کائنات کو کوئی بنانے اور چلانے والا ہے بھی یا نہیں! تو یہی تصور ذہنوں میں راسخ ہوگا کہ یہ کائنات بطورِ حادثہ (accidentally) وجود میں آ گئی ہے اور بس قوانین فطرت کے تحت رواں دواں ہے۔ اگر سائنس اس ذہن سے پڑھائی جائے گی تو نتیجہ یہی نکلے گا' جس کے متعلق علامہ اقبال نے کہا ہے:

خرد کی تنگ دامانی سے فریاد
تجلی کی فروانی سے فریاد
گوارا ہے اسے نظّارۂ غیر
نگہ کی نامسلمانی سے فریاد!

گویا ایسی صورتِ حال میں نامسلمانی تو آپ سے ہی آپ آئے گی۔

علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام.....

اسی ضمن میں علامہ کا ایک بڑا پیارا شعر ہے۔

عشق کی تیغِ جگر دار اڑا لی کس نے؟
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی!

ہمارا ''علم''، عشق خداوندی سے بالکل خالی ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ علامہ کے ہاں اردو اور فارسی شاعری میں زیادہ تر لفظ عشق ہی آیا ہے' محبت کا لفظ شاذ ہی کہیں ہوگا۔ علامہ اس شعر میں لفظ ''عشق'' محبت و معرفتِ الٰہی کے لیے لائے ہیں۔ علّامہ کہتے ہیں کہ اس 'علم' میں سے ایمان و عرفان والی چیز تو نکلی ہوئی ہے تو اس کا حال اس نیام جیسا ہے جس میں تلوار ہی نہ ہو۔ بس ایک خول سا ہے جس کے اندر کچھ نہیں ہے' بس چند اعداد و شمار (facts and figures) ہیں اور کچھ data ہے۔ انسان انہی چکروں میں رہتا ہے اور ان کو ہی بالذات ''حقیقی علم'' سمجھتا

ہے۔ اس علم میں خالق کائنات اور فاطر فطرت کا تصور سرے سے موجود ہی نہیں بلکہ اس کی نفی ہے۔ اس وقت کائنات اور انسان سے متعلق یہ علم ہمارے پاس ہے۔ سائنس کے علاوہ دوسرے علوم کا معاملہ تو اس سے بھی زیادہ دگرگوں ہے۔ معاشرتی علوم کو آپ دیکھیں گے' تاریخ اور فلسفۂ تاریخ کو آپ پڑھیں گے' نفسیات' فلسفہ اور پولیٹکل سائنس کو پڑھیں گے' معاشیات واقتصادیات اور عمرانیات واخلاقیات کو پڑھیں گے تو ان کا معاملہ سائنس سے بھی گیا گزرا ہے۔ ان تمام کی رگ و پے میں مادّہ پرستی' الحاد اور دہریت اس طرح سرایت کیے ہوئے ہے جیسے انسانی جسم میں خون!!

یہ ہے فی الواقع وہ صورتِ حال جس سے ہم دوچار ہیں۔ جب تک حقیقی علم یعنی وہ علم جس کی اساس قرآن حکیم ہو اور جو اپنے ظاہر اور باطن کے لحاظ سے توحید اور ایمان پر مبنی ہو' وہ 'علم' وجود میں نہ آئے محض نظامِ تعلیم کیا کرے گا؟ جو علم آپ کے پاس ہے' تعلیم اور نظامِ تعلیم تو اس کو متعلّمین کے اذہان وقلوب میں منتقل کرنے کا ذریعہ ہے۔ وہ تو فکر ونظر اور کردار وعمل کے لیے ایک راستہ معین کرنے کا ذریعہ ہے۔ پس موجودہ علم کا قرآن حکیم کے ساتھ کوئی ربط وتعلق' کوئی رشتہ ووابستگی' کوئی جوڑ اور کوئی پیوند موجود نہیں ہے۔ اس میں قرآن اور حکمت واستدلالِ قرآن سے ہم آہنگی موجود ہی نہیں ہے۔ ہمارے پاس جو علم دستیاب ہے' وہ مغرب ہی سے مانگا تانگا علم ہے۔ کبھی ہم نے ان کو علم دیا تھا اور مغرب نے غرناطہ اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں سے علم لیا تھا' اب ہم وہاں جا کر ناک رگڑتے ہیں اور وہاں سے پی ایچ ڈی کی ڈگریاں لے کر آتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اب ہم بھکاری ہیں اور ان سے بھیک مانگ کر ان کا ہی علم لے کر آ رہے ہیں۔ اب وہیں سے علم کے لوازمات آ رہے ہیں جس سے ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کے ذہن کا وہ سانچہ بن رہا ہے جس میں اللہ' خالق کائنات' وحی' نبوت ورسالت' الہامی کتب' بعث بعد الموت اور محاسبہ اُخروی کے ایمانیات سما ہی نہیں سکتے۔ ایسی صورتِ حال میں دین صرف ایک موروثی عقیدہ (dogma) بن کر رہ جاتا ہے اور اکثر لوگ تو اس خواہ مخواہ کے dogma کو بھی تج دیتے ہیں۔

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر

معلوم یہ ہوا کہ تینوں اعتبارات سے اصلاحِ معاشرہ کے معاملے میں اگر حکومت واقعی مخلص ہے تو اس کے لیے لازم ہے کہ وہ عزمِ مصمّم کے ساتھ مخلصانہ اور مضبوط مساعی (determined efforts) کرے۔ لیکن آپ یہ نہ سمجھئے کہ حکومت کے کرنے سے یہ سب

کچھ ہو جائے گا' اس لیے کہ حکومت کی اپنی حدود (limitations) ہیں۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ اس کی تو اپنی مصلحتوں کا معاملہ بھی ہے اور مجبوریوں کا بھی۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ جن کو ہوش آ گیا ہو' جن کے سامنے یہ پورا نقشہ موجود ہو' جن کے سامنے اصل مرض اور اس کی صحیح تشخیص موجود ہو' اب ان میں سے کچھ باہمت لوگ کمرِ ہمت کسیں اور میدان میں آئیں۔ پھر سب سے اہم کام یہ کریں کہ قرآن حکیم کی فکری سطح پر نشر و اشاعت کا اہتمام کریں' جو لوگوں کے ذہنوں کو مسخر کر کے ان کے قلوب میں سرایت کر سکے۔ پھر یہ کہ پورے علم کی از سرِ نو تدوین اس نوع سے کریں کہ تمام علوم میں قرآن حکیم رچ بس جائے۔ خواہ فزکس پڑھائی جا رہی ہو' چاہے کیمسٹری' جیالوجی یا بیالوجی پڑھائی جا رہی ہو' خواہ کوئی اور علم پڑھایا جا رہا ہو' ان علوم میں اور قرآن حکیم کی تعلیمات میں ہم آہنگی پورے طور پر موجود ہو۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ کام کرے کون؟ اس مرحلہ پر پھر علامہ اقبال ہی کا شعر میرے ذہن میں آ رہا ہے ؎

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملّت کے مقدّر کا ستارا!

افراد آگے آئیں اور مل کر ادارے بنائیں اور ان کاموں کا آغاز کریں۔ جیسے جیسے معاشرے سے response ملتا جائے' کام کو آگے بڑھایا جائے۔

ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کی فکر اور ان کی جِدّ و جُہد

اس موقع پر میں دو مثالیں آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ پہلی مثال تو ہے ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کی' جو میں کئی مرتبہ عرض کر چکا ہوں اور لکھ بھی چکا ہوں۔ حال ہی میں ماہنامہ ''حکمتِ قرآن'' کے شمارے میں' میں نے ''دعوت رجوع الی القرآن'' کی تاریخ لکھی ہے۔ اس میں' میں نے ذکر کیا ہے کہ میں نے فہم قرآن کے لیے جن جن ذرائع (sources) سے استفادہ کیا ہے' ان میں علامہ ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم اور ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم بھی شامل ہیں۔ علومِ سائنس کو مسلمان بنانے کے ضمن میں ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کی سوچ اور ان کا فکر بہت بلند ہے (۱۰)۔ ان کو جس شدت کے ساتھ اس کی اہمیت کا احساس ہوا' وہ مجھے اور کہیں نظر نہیں آیا۔

---

(۱۰) اس ضمن میں ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کی تالیف ''قرآن اور علمِ جدید'' کا مطالعہ نہایت مفید رہے گا۔ (مرتب)

اس موقع پر بھی اس امرِ واقعہ کو پھر دیکھ لیجئے کہ ہمارے ہاں نوکر شاہی اور بیوروکریسی کا عمل دخل کتنا ہے۔ اُس زمانے میں جبکہ صدر ایوب مرحوم ''کوسِ لمن الملک'' بجا رہے تھے (ان کا اختیار اور دبدبہ ذرا ذہن میں لائیے!) وہ ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کے فلسفے اور نظریات سے متاثر ہوئے اور انہوں نے چاہا کہ یہ فلسفہ نظامِ تعلیم میں سمو دیا جائے۔ اس کے لیے انہوں نے بھرپور کوشش کی، لیکن ہمارے ہاں جو بیوروکریٹک ڈکٹیٹرشپ مسلط ہے، وہ آڑے آئی اور صدر ایوب بھی، جن کے لیے اگر ''حاکم مطلق'' کی اصطلاح استعمال کی جائے تو غلط نہ ہوگا، کچھ نہ کر سکے اور ساری اسکیم دھری رہ گئی۔

اس کے بعد ایک اور مرحلہ آیا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ خدا بخش بچہ صاحب اکثر حکومتوں کے دور میں وزیر رہے ہیں۔ کچھ لوگوں میں صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ خود کو ہر نوع کے ماحول کے ساتھ سازگار (adjust) کر لیتے ہیں۔ بچہ صاحب کو علامہ اقبال کی شاعری اور ان کے فکر سے بڑی گہری ذہنی مناسبت تھی۔ ان کے متعلق چودھری مظفر حسین صاحب، جو اس وقت آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس لاہور سے متعلق ہیں، نے روایت کی ہے (اور یہ روایت بھی میں نے 'حکمت قرآن'' میں لکھ دی ہے) کہ بچہ صاحب نے چودھری صاحب سے نہایت اصرار کے ساتھ فرمائش کی کہ مجھے کوئی ایسا شخص بتائیے جو نظامِ تعلیم کو اسلامی بنا سکتا ہو، لیکن اس پر جماعت اسلامی کی چھاپ نہ ہو۔ (چونکہ جماعت اسلامی سیاسی میدان میں ہے اور اس کے کسی شخص کو لاتے ہیں تو دوسری پارٹیوں کے سیاست دان معترض ہوں گے۔) چودھری مظفر حسین صاحب نے بتایا کہ وہ مولانا مودودی مرحوم کے پاس گئے اور ان کے سامنے یہ مسئلہ رکھا۔ مولانا مرحوم نے فوراً، ایک لمحہ کے توقف کے بغیر، کہا کہ ڈاکٹر رفیع الدین صاحب اس کام کے لیے مناسب ترین شخص ہیں، ان کی خدمات سے استفادہ کیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب کو بلوایا گیا اور یہ کام ان کو تفویض کیا گیا، لیکن پھر وہی نوکر شاہی کی آمریت آڑے آئی اور ان کو کام کرنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم جب اس صورتِ حال سے دوچار ہوئے تو انہوں نے وہاں سے استعفا دیا اور پھر بحیثیت فرد انہوں نے اپنے فکر کے مطابق کام کے آغاز کے لیے ''آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس'' قائم کی۔ فزکس کی ایک نصابی کتاب (text book) خود مرتب کر کے شائع کی اور اس کے دیباچے میں لکھا کہ اگر فزکس اور دوسرے علوم کو اس طور

پر مرتب کیا جائے تو اس میں اسلام' قرآن اور ایمان کو رچایا' بسایا اور سمویا جا سکتا ہے۔ لیکن ہوا یہ کہ ان کی زندگی کا چراغ اچانک ایک روڈ ایکسیڈنٹ کے نتیجہ میں کراچی میں گُل ہو گیا اور وہ پوری کی پوری اسکیم پھر دھری رہ گئی۔ ادارہ تو باقی رہا اور اب بھی ہے' لیکن وہ روحِ رواں جب نہ رہی تو جو اعوان و انصار ساتھ تھے' وہ کام کو آگے نہ بڑھا سکے۔ اب چودھری مظفر حسین صاحب سوچ رہے ہیں کہ ملازمت سے فارغ ہو کر ہمہ تن اس کام کے لیے خود کو وقف کر دیں۔ اللہ کرے کہ ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کا لگایا ہوا یہ پودا پروان چڑھے اور یہ ادارہ فی الواقع وہ کام کر سکے جس کی فی الوقت شدید ترین ضرورت ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں پہلی مثال تو ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کی میں نے آپ کے سامنے پیش کر دی ہے۔

دعوت رجوع الی القرآن کا آغاز

دوسری مثال میں خود اپنی پیش کرتا ہوں۔ یہ مرکزی انجمن خدام القرآن اور یہ دعوت رجوع الی القرآن ایک فرد ہی سے تو شروع ہوئی تھی۔ میں ۱۹۶۵ء کے اواخر میں ساہیوال سے لاہور منتقل ہوا کہ مجھے اپنی زندگی دعوت رجوع الی القرآن کے لیے لگانی ہے۔ میں نے آج جو تجزیہ اور تشخیص آپ کے سامنے رکھی ہے' اس وقت بھی یہی میرے سامنے تھی' بلکہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی بات تو اُس وقت تک میرے علم میں تھی بھی نہیں۔ وہ تو بہت بعد میں جب میرے سامنے آئی تو مجھے اطمینان ہوا کہ ع ''متفق گردید رائے بوعلی با رائے من'' اور مجھے انشراحِ صدر ہو گیا۔

علامہ اقبال کے فارسی کلام سے بھی اس وقت میرا زیادہ ربط نہیں تھا۔ جب علامہ کا فارسی کلام پڑھا اور ان کے فارسی کلام کے ذریعے عظمت قرآن کے جو حقائق سامنے آئے تو یہ بھی بعد کی بات ہے۔ اس سے قبل ہی میرا ذہن غور و فکر کے بعد اس بات پر مرتکز ہو چکا تھا کہ ''جا ایں جا است!'' کرنے کا اصل کام یہی ہے کہ قرآن حکیم کو اعلیٰ علمی سطح پر تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہنوں میں پہنچانے کی اس طرح کوشش کی جائے کہ یہ پہلے فکر و شعور اور عقل و ادراک کو مسخّر کرے اور وہاں سے پھر یہ قلوب میں سرایت و نفوذ کرے۔ یہ ہے اصل میں اس دور کی اصل ضرورت۔ قرآنی فکر کو by-pass کر کے کوئی دعوت اٹھائی گئی یا تحریک چلائی گئی تو معاشرہ بحیثیت مجموعی کوئی خوشگوار اور پائیدار تبدیلی کبھی قبول نہیں کرے گا۔ یہ کام یقیناً مشکل اور کٹھن

ہے' کوئی آسان بات نہیں ہے۔ اعلیٰ فکری سطح پر قرآن مجید کی قوت سے باطل نظریات سے پنجہ آزمائی کرنا سہل کام نہیں ہے۔ وعظ و نصیحت کے ذریعے سے کچھ لوگوں کے اندر سوئی ہوئی نیکی کو جگا لینا نسبتاً آسان کام ہے۔ معاشرے میں معتد بہ تعداد ایسے لوگوں کی ہوگی جن کے اندر نیکی خوابیدہ ہے اور اسے بیدار کرنا ہے۔ اس مقصد کے لیے تو وعظ و نصیحت کارگر ہو جائے گی' لیکن جب یہ معاملہ ہو کہ ؎

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ!

یعنی ذہن و شعور اور فکر و نظر پر جب باطل نظریات نے پوری طرح قابو پا رکھا ہو تو ان سے پنجہ آزمائی آسان کام نہیں۔ یہ بڑا کٹھن' نہایت دشوار' صبر آزما اور دِقّت طلب (herculean) کام ہے۔ لیکن جب تک یہ کام نہیں کیا جائے گا' معاشرے میں کوئی پائیدار اور مستحکم بنیادی و اساسی تبدیلی نہیں آئے گی۔ یہ میرے اپنے غور و فکر کا حاصل اور میری اپنی تشخیص تھی جس کے مطابق میں نے اواخر ۱۹۶۵ء میں دعوت رجوع الی القرآن کا ذہن میں نقشہ بنا کر خالصتاً نصرت و تائید الٰہی کے بھروسے پر ۱۹۶۶ء کے اوائل سے کام کا آغاز کر دیا۔ سات سال تک میں نے ایک فرد کی حیثیت سے کام کیا۔ کوئی ادارہ نہیں' کوئی تنظیم نہیں' کوئی انجمن نہیں' کوئی جماعت نہیں۔ پورا کام انفرادی طور پر ہوا۔ میں نے ماہنامہ ''میثاق'' بھی مولانا امین احسن اصلاحی صاحب سے لے لیا تھا' وہ بھی نکال رہا تھا۔ بعد ازاں بعض مخلصین میسر آئے اور ان کے تعاون سے مختلف مقامات پر مطالعہ درسِ قرآن کے حلقے قائم ہوئے۔ اس دوران پریکٹس بھی جاری رہی۔ اس دور میں میری کیفیت مولانا حسرت موہانی مرحوم کے اس شعر کی کامل تصویر تھی کہ ؎

ہے مشقِ سخن جاری' چکّی کی مشقت بھی
اِک طرفہ تماشا ہے حسرتؔ کی طبیعت بھی!

مرکزی انجمن خُدّام القرآن کا قیام

اس دور میں پریکٹس اور دعوتی کام دونوں ساتھ چل رہے تھے۔ مولانا اصلاحی کی تفسیر ''تدبرِ قرآن'' کی پہلی جلد اور اپنے چند چھوٹے چھوٹے رسالے اپنے ذاتی اشاعتی ادارے (دارالاشاعت الاسلامیہ) سے شائع کیے تاکہ دعوت و پیغامِ قرآنی کے لیے راہ ہموار ہو اور

کچھ ابتدائی کام (spade work) انجام پا جائے۔ بالآخر میری حقیری کوشش بارگاہِ ربّ العزت میں قبول ہوئی اور چند فعال اعوان و انصار مجھے عطا ہوئے جن کے تعاون سے یہ کام انفرادی سطح سے اجتماعی دور میں داخل ہوا۔ ان حضرات کے تعاون سے ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن کا قیام عمل میں آیا' جس کے دستور کا افتتاحیہ آپ حضرات ضرور پڑھیے۔ اس سے آپ کے سامنے اس کام کا نقشہ سامنے آئے گا جو میں کر رہا ہوں۔ یہ وہی کام ہے' جس کی ضرورت کا میں نے آج کی تقریر میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ میں جو کام کر رہا ہوں' اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے۔ اس میں سراسر اللہ کی توفیق اور اس کا فضل و کرم میرے شامل حال رہا ہے۔ قرآن حکیم کا یہ اعجاز ہے کہ اُس نے مجھے تابع (possess) کیا ہے۔ وہ میرے شعور و قلب پر اس طرح مسلّط ہوا ہے کہ اس نے میرے لیے ہلنے جلنے اور اِدھر اُدھر دیکھنے کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔ چنانچہ پروفیشن ختم ہوا۔ دعوت رجوع الی القرآن کی دھن اور لگن کے سوا ہر شے دل سے رخصت ہو گئی اور اب حضرت مجذوب کے شعر کے مصداق میری کیفیت یہ ہے کہ ؎

ہر تمنّا دِل سے رخصت ہو گئی
اب تو آ جا اب تو خلوت ہو گئی!

میں نے انجمن کے دستور میں حفیظ جالندھری صاحب کا یہ شعر بھی نقل کیا ہے جو انہوں نے منظوم ''شاہنامہ اسلام'' شروع کرتے وقت کہا تھا ؎

کیا فردوسیٔ مرحوم نے ایران کو زندہ!
خدا توفیق دے تو میں کروں اسلام کو زندہ!

میں نے دوسرے مصرعہ میں اپنی کیفیت کے اظہار کے لیے ایک لفظ کا تغیر کیا ہے اور وہاں لکھا ہے کہ ع ''خدا توفیق دے تو میں کروں قرآن کو زندہ''۔ الحمدللہ' مجھ پر اس جذبے کی اس قدر ارزانی ہوئی کہ دل سے ہر شے نکل گئی اور میں اپنا پروفیشن تج کر ہمہ وقت' ہمہ تن اور ہمہ جہت اللہ تعالیٰ کی نصرت کے طفیل اسی کام میں لگا ہوا ہوں۔

میں پورے انشراحِ صدر کے ساتھ یہ بتا رہا ہوں کہ **الحمد لِلّٰہ والمنّۃ** ۱۹۷۲ء کے بعد میرے وقت کا کوئی بھی حصہ کسب معاش پر صرف نہیں ہوا۔ میری توانائی' میری قوت' میری صلاحیت اور میرا وقت جو کچھ بھی ہے وہ اسی کام میں لگا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی وقت منفعت کی کوئی دوسری شکل بھی پیدا کر دی۔ وہ یہ کہ ٹیلی ویژن اور ریڈیو کے

پروگرام ملے تو ان کا معاوضہ بھی مل گیا' لیکن میں نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی طرف رجوع اس نقطۂ نظر سے ہرگز نہیں کیا کہ اس سے مجھے اپنے لیے معاش پیدا کرنی ہے۔ معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ! تاہم ثانوی طور پر جو کچھ یافت ہوگئی تو میں نے یہ سمجھا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ وہ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا: ﴿ رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ ﴿۲۴﴾ ﴾ (القصص) ''پروردگار! جو خیر بھی تو میری جھولی میں ڈال دے' میں اس کا محتاج ہوں''۔ بالکل میرا بھی یہی معاملہ تھا۔ الحمدللہ' ثم الحمدللہ!!

ان دس سالوں میں اللہ تعالیٰ نے مجھ سے جو کام لیا ہے' اس کے متعلق مجھے کچھ کہنے کی حاجت نہیں ہے۔ یہ مرکزی انجمن خدام القرآن' یہ قرآن اکیڈمی' پھر پاکستان ہی نہیں دوسرے ممالک میں دعوت رجوع الی القرآن کا یہ چرچا اور لوگوں کا قرآن کی طرف یہ التفات۔ یہ سب کچھ آپ کے سامنے ہے!

مرکزی انجمن خُدّام القرآن کے قیام کا مقصد

اب میں چاہوں گا کہ مرکزی انجمن خدام القرآن کی قراردادِ تاسیس کا خلاصہ آپ کے سامنے رکھ دوں۔ اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ ابتدا ہی سے کیا کام میرے پیش نظر رہا ہے:

''مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے قیام کا مقصد

منبع ایمان — اور سرچشمہ یقین — قرآن حکیم کے علم و حکمت کی وسیع پیمانے اور اعلیٰ علمی سطح پر تشہیر و اشاعت ہے تاکہ امتِ مسلمہ کے فہم عناصر میں تجدید ایمان کی ایک عمومی تحریک برپا ہو اور اس طرح — اسلام کی نشأۃِ ثانیہ — اور — غلبۂ دین حق کے دورِ ثانی کی راہ ہموار ہو سکے۔ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ!!''

میری آج کی تقریر کو پیش نظر رکھیے اور اس قراردادِ تأسیس کے ایک ایک لفظ پر غور کیجیے۔ آپ کو میری یہ تقریر اسی قرارداد کی تشریح و تصریح نظر آئے گی۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ اس قرارداد کے ایک ایک لفظ میں آپ کو میری تقریر کا خلاصہ نظر آئے گا۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ دس بارہ برس قبل کی عبارت ہے اور ان سالوں میں جو کام ہوا ہے اس میں میرے کسی ذاتی کمال کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اس سارے کام میں اللہ ربّ العزت کی توفیق' قرآن کا اعجاز اور میرے اعوان و انصار' رفقاء و معاونین اور احباب کا تعاون

شامل ہے' اور ظاہر بات ہے کہ ان حضرات کا یہ تعاون بھی عطیۂ الٰہی ہے۔ کوئی ہمدرد' رفیق اور معاون ملتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے کرم و فضل سے ہی ملتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ تمام انسانوں کے دل اللہ کی انگلیوں کے مابین ہیں' وہ جدھر چاہتا ہے ان کو پھیر دیتا ہے۔ چنانچہ ہمیں دعا کرنی چاہیے: اَللّٰھُمَّ صَرِّفْ قُلُوْبَنَا اِلَی الْاِسْلَام وَ اِلَی الطَّاعَۃِ وَ اِلَی الْاِیمَانِ وَ اِلَی الْقُرآن یعنی اے ہمارے مالک! ہمارے دلوں کو پھیر دے' اسلام کی طرف' اطاعت کی طرف' ایمان کی طرف اور قرآن کی طرف' جو منبع ایمان اور سرچشمۂ یقین ہے۔

انجمن کے پیش نظر ہے قرآن اکیڈمی کا صحیح طور پر اپنے مقصد کے حصول کی طرف پیش قدمی کرنا۔ یعنی چند جدید تعلیم یافتہ فہیم عناصر کو قرآن کے علم و حکمت سے اعلیٰ علمی سطح پر اس طرح مسلّح کرنا کہ وہ جاہلیت جدیدہ کے ملحدانہ نظریات کا قرآن حکیم کی تعلیمات کی روشنی میں اعلیٰ علمی و فکری سطح پر ابطال اور توحید کا احقاق کر سکیں' اور علم کو حقیقی معنوں میں مسلمان بنا کر ایسا نصابِ تعلیم مرتب کرنے کے کام کا آغاز کر سکیں جو اذہان کو مسخر کر کے قلوب میں نفوذ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ یہی وہ کام ہے جس کی ضرورت کا احساس اپنے زمانۂ آخر میں علامہ اقبال کو ہوا' جس کے نتیجے میں پٹھان کوٹ میں ''دارالسلام'' قائم ہوا تھا۔ اسی ضرورت کے تحت 'الہلال' و 'البلاغ' والے مولانا ابوالکلام نے ''دارالارشاد'' قائم کیا تھا۔ ان دونوں اداروں کے قیام میں بھی یہی مقصد پیش نظر تھا کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ فہیم عناصر کو اعلیٰ علمی و فکری سطح پر قرآن مجید پڑھایا جائے۔ میں نے ان دونوں نقشوں کا ذکر اپنے کتابچے ''اسلام کی نشاۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام'' میں کیا ہے۔ یہ دونوں کام صرف ابتدائی نقشوں تک محدود رہے' آگے نہ بڑھ سکے۔

وہی خواب تیسری مرتبہ میں نے ۱۹۶۷ء میں اپنے فکر و شعور کی آنکھوں سے دیکھا تھا اور اس کو اپنے کتابچے ''اسلام کی نشاۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام'' میں تفصیل سے بیان کر دیا تھا۔ یہ کتابچہ ہی دراصل انجمن کے قیام اور اس کی سرگرمیوں کا نقطۂ آغاز بنا۔ اور اب تک جو کچھ بھی کام ہوا ہے وہ ''قرآن اکیڈمی'' کے صحیح نہج پر پیش رفت کے نقطۂ نظر سے ہوا ہے تاکہ اس اکیڈمی کے ذریعے اعلیٰ جدید تعلیم یافتہ چند فہیم نوجوانوں کو وہاں رکھ کر انہیں اعلیٰ علمی و فکری سطح پر علومِ قرآنیہ و دینیہ سے روشناس کرایا جائے تاکہ ''علم'' کو مسلمان بنانے کے راستے کا دروازہ کھلے اور یہ نوجوان تمام علوم جدیدہ میں قرآن حکیم کی تعلیمات کو داخل کرنے اور سمونے کی صلاحیت اور استعداد اپنے اندر پیدا کر کے اس کوشش کا آغاز کر سکیں۔ جب تک وہ ''علم'' جو ملحد

ہے' کافر ہے' اس ''علم'' کو مسلمان نہ بنایا جائے اس وقت تک ہم یہ کہنے کے قابل نہیں ہو سکتے کہ یہ وہ نصابِ تعلیم ہے جس کے ذریعے سے لوگوں کے اذہان وقلوب میں قرآن حکیم اتارا جاسکتا ہے۔ اس کے بغیر اگر ہم نصاب کو بدلنے کا مطالبہ کریں تو ہوگا کیا؟ وہ نصاب تو موجود ہی نہیں ہے' جس میں قرآن اور دین رچا بسا ہو۔ ہوسکتا ہے کہ ان مطالبات سے وقتی طور پر کچھ سطحی نوعیت کی تبدیلیاں ہو جائیں' جیسی کہ گاہے گاہے کچھ ہوتی بھی رہی ہیں' لیکن بحیثیت مجموعی ''مسلمان علم'' ہمارے پاس موجود ہی نہیں ہے۔ اسے وجود میں لانے کی ہمیں بھرپور کوشش کرنی چاہیے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر واحسان ہے کہ چند اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان مل گئے ہیں جنہوں نے اپنی زندگیوں کو اسی کام کے لیے وقف کرنے کے عزم کے ساتھ قرآن اکیڈمی میں طالب علمانہ حیثیت سے شمولیت اختیار کی ہے۔ مجھ پر اللہ تعالیٰ کا مزید فضل وکرم یہ ہوا کہ قرآن اکیڈمی کی اس رفاقت اسکیم میں میرے دو بچے بھی شامل ہیں جن میں سے ایک نے ایم بی بی ایس اور دوسرے نے فلسفہ میں ایم اے کیا ہے۔

ہمیں قرآن اکیڈمی کے اس منصوبے کو آگے بڑھانے کے لیے تعاون اصلاً تعلیم یافتہ نوجوانوں کا درکار ہے جو اپنے خوش نما کیریئرز کو اللہ کے دین اور اس کی کتابِ مبین کی خدمت کے لیے تج کر خود کو قرآن اکیڈمی کی رفاقت اسکیم کے لیے پورے عزم صمیم کے ساتھ پیش کریں۔ وہی میرے اصل معاون اور حقیقی محسن ہوں گے۔ پیسے کی مجھے اتنی ضرورت نہیں ہے' میرا ان سترہ سالوں کا تجربہ یہ ہے کہ آج تک کوئی کام پیسے کی کمی کی وجہ سے نہیں رکا ہے اور مجھے یقین ہے کہ' ان شاء اللہ' آئندہ کبھی رکے گا بھی نہیں۔ ہمارے معاشرے میں ایسے اصحابِ خیر بحمد اللہ موجود ہیں جو اس کام میں مالی تعاون کے لیے پیش قدمی کرتے رہے ہیں اور ان شاء اللہ آئندہ بھی کریں گے۔ اصل ضرورت تو آدمی ہیں ع ''انسانم آرزوست!'' ان نوجوانوں کی ضرورت ہے جنہوں نے اعلیٰ تعلیم یعنی فلسفہ' نفسیات' پولیٹیکل ہسٹری' پولیٹیکل سائنس' معاشیات' اقتصادیات' عمرانیات واخلاقیات نیز فزکس جیسے علوم میں ایم اے یا پی ایچ ڈی کیا ہو' اور ان کے سامنے جو کیریئر ہے اس کو ترک کر کے نبی اکرم ﷺ کے اس ارشاد کو حرزِ جاں بنائیں: ((خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَ عَلَّمَہٗ)) کہ تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن کا علم سیکھیں اور سکھائیں' قرآن پڑھیں اور پڑھائیں' اور اسی کام کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ یہ صحیح بخاری کی روایت ہے اور اس کے راوی ہیں خلیفۂ برحق' شہید مظلوم حضرت

عثمان ذُوالنّورین ؓ جن کو قرآن حکیم سے والہانہ لگن تھی۔ صحابہ کرام ؓ میں جو چوٹی کے قُرّاء تھے' عثمان غنیؓ ان میں شامل تھے۔ آپؓ قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے شہید ہوئے ہیں اور آپؓ کا خون گرا ہے آیت قرآنی فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ پر! چنانچہ ہمیں چاہیے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی اس بشارت کو اپنا motto بنائیں۔

خلاصۂ کلام

سابقہ جمعہ اور آج کی تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ اصلاحِ معاشرہ کے لیے اصل ضرورت حقیقی ایمان کی ہے' جس کی مثبت اساسات (۱) محبتِ الٰہی' (۲) محبتِ رسول ﷺ اور (۳) اللہ کی راہ میں جہاد کی محبت کے جذبات ہیں —— اور منفی اساس خوف کا جذبہ ہے جس میں اصل اہمیت آخرت کے خوف کو دلوں میں بٹھانا ہے۔ ایمان کا منبع اور سرچشمہ قرآن مجید ہے' لہٰذا اس کو اوڑھنا اور بچھونا بنانا ہوگا اور اس کی تعلیمات کے لیے پریس' ریڈیو' ٹیلی ویژن کے ذرائع ابلاغ کو ایک بامقصد منصوبہ بندی کے تحت استعمال کرنا ہوگا۔ ان کو ان تمام لغویات سے پاک کرنا ہوگا جو لوگوں کو غیر شعوری طور پر نامسلمان اور لذّت کوش و تعیّش پسند بنانے کا سبب بن رہی ہیں۔ پھر علم کو خالصتاً مسلمان بنانا ہوگا۔ تمام علوم کو از سرِ نو اس طرح مدوّن کرنا ہوگا کہ اس میں قرآن حکیم کا علم الحقائق تانے بانے کی طرح گتھا ہوا ہو۔

اس سلسلہ تقاریر کا تیسرا اور آخری حصہ ''اصلاحِ معاشرہ کا انقلابی تصور'' کے عنوان سے میں' ان شاء اللہ' آج شام جناح ہال میں مرکزی انجمن کی دس سالہ تقریبات کے افتتاحی اجلاس میں پیش کروں گا۔ نظام درست نہیں ہوگا تو معاشرہ درست نہیں ہوگا۔ نظام ظالمانہ' جابرانہ اور استحصالی ہوگا تو اس کے نتیجے میں نفرت و کدورت اور انتقام کے جذبات پیدا ہوں گے' مثبت احساسات و جذبات پیدا نہیں ہو سکتے۔ اگر اس نظام کو بدلنے کے لیے یہاں صحیح نہج پر اسلامی انقلاب کی کوششیں نہ کی گئیں تو اصلاحِ معاشرہ کے لیے اوپر کی لیپا پوتی سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ!!

خطاب ③

اصلاحِ معاشرہ کا انقلابی تصوّر

مرکزی انجمن خُدّام القرآن کی دس سالہ تقریب
منعقدہ جناح ہال لاہور کے افتتاحی اجلاس میں
۱۲/ نومبر ۱۹۸۲ء کا خطاب

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اعوذ باللّٰہ من الشَّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَیِّنٰتِ وَاَنۡزَلۡنَا مَعَهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡمِیۡزَانَ لِیَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ ۚ وَاَنۡزَلۡنَا الۡحَدِیۡدَ فِیۡهِ بَاۡسٌ شَدِیۡدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِیَعۡلَمَ اللّٰهُ مَنۡ یَّنۡصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالۡغَیۡبِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیۡزٌ ﴿۲۵﴾﴾ (الحدید)

وَقَالَ اللّٰہُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰی كَمَا وَرَدَ فِیۡ سُوۡرَةِ الشُّوۡرٰی:

﴿فَلِذٰلِكَ فَادۡعُ ۚ وَاسۡتَقِمۡ كَمَاۤ اُمِرۡتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ ۚ وَقُلۡ اٰمَنۡتُ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنۡ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرۡتُ لِاَعۡدِلَ بَیۡنَكُمۡ ؕ﴾ (آیت ۱۵) صدق اللہ العظیم

رَبِّ اشۡرَحۡ لِیۡ صَدۡرِیۡ، وَیَسِّرۡ لِیۡ اَمۡرِیۡ ، وَاحۡلُلۡ عُقۡدَةً مِّنۡ لِّسَانِیۡ ، یَفۡقَهُوۡا قَوۡلِیۡ!

محترم صدرِ مجلس، محترم مہمانِ خصوصی، علمائے کرام اور محترم حاضرین!

میری آج کی گفتگو دراصل ایک سلسلۂ تقاریر کی تیسری کڑی ہے۔ اس سے قبل دو خطاباتِ جمعہ میں ''اصلاحِ معاشرہ کا قرآنی تصور'' کے موضوع پر مسجد دارالسلام میں اپنے کچھ خیالات کا اظہار کر چکا ہوں، جن میں، میں نے عرض کیا تھا کہ اصلاحِ معاشرہ کا جو قرآنی پروگرام میرے سامنے آتا ہے، اس کی تین سطحیں ہیں۔ ایک اس کی جڑ اور بنیاد ہے، جسے میں نے پچھلی تقاریر میں ''پیر'' سے تعبیر کیا تھا۔ ایک اس کا ذروۂ سنام یعنی چوٹی ہے جسے میں نے ''سر'' سے تعبیر کیا تھا اور ایک اس کی درمیانی سطح ہے جس کو میں نے ''دھڑ'' قرار دیا تھا۔

اس کی جڑ اور بنیاد تعمیرِ سیرت و کردار کا پروگرام ہے اور میں اس ضمن میں عرض کر چکا ہوں

کہ اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ یہ بات لوگوں کو معلوم نہیں کہ خیر کیا ہے' شر کیا ہے' نیکی کیا ہے اور بدی کیا ہے' بلکہ اصل مسئلہ وہی ہے جسے مرزا غالب نے اپنے اس شعر میں بیان کیا کہ: ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی!

پھر طبیعت کو اِدھر لانے کے لیے اصل ضرورت ایک مضبوط قوتِ ارادی اور تربیت ارادہ کی ہے' جسے علامہ اقبال نے تعمیرِ خودی سے تعبیر کیا ہے۔ اس مقصد کے لیے درحقیقت انسان کے جذبے کے درست ہونے کی ضرورت ہے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ بنیادی طور پر انسان کے جذبات دو طرح کے ہیں: ایک ہے محبت کا مثبت جذبہ اور ایک ہے خوف کا منفی جذبہ۔ دنیا کے دوسرے نظاموں اور معاشروں میں محبت کا جذبہ کہیں وطن کی محبت' کہیں قوم کی محبت' کہیں نسل کی محبت' کہیں زبان کی محبت' کہیں کسی شخصیت کی محبت پر استوار ہوتا ہے اور ان محبتوں کی بنیاد پر ہی سیرت و کردار کی تعمیر ہوتی ہے' لیکن اسلام نے جو بلند ترین محبتیں عطا کی ہیں' وہ ہیں اللہ کی محبت اور اس کے رسول ﷺ کی محبت۔

میں نے گزشتہ تقاریر میں عرض کیا تھا کہ اصل میں ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم انسانی فکر و نظر کی مقرر کردہ محبتوں اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ محبتوں' دونوں سے تہی دست اور تہی دامن ہیں۔ اگر وطن' قوم' نسل' زبان' یا کسی شخصیت کی محبت ہوتی تو کم سے کم دنیا میں ایک باوقار زندگی بسر کرنے کے لیے ہمیں کوئی بنیاد مل جاتی' لیکن یہ محبتیں ہمارے مزاج سے مناسبت نہیں رکھتیں۔ ہمارا خمیر جس مٹی سے اُٹھا ہے' اس میں ان محبتوں کی کوئی بنیاد اور کوئی گنجائش نہیں ہے۔ علامہ اقبال نے صحیح کہا تھا کہ ع ''مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا!'' یعنی ہم زمین کے ساتھ بندھے ہوئے نہیں ہیں۔ ہمارا ذہن اور ہمارا مزاج وطن پرستی' قوم پرستی' نسل پرستی' زبان پرستی' شخصیت پرستی سے قطعی مناسبت نہیں رکھتا اور ان سے بہت بعید ہے۔ لہٰذا ہمارے پاس یہ محبتیں بھی نہیں ہیں اور جو محبتیں ہونی چاہئیں تھیں یعنی اللہ کی محبت اور اس کے رسول ﷺ کی محبت' بدقسمتی سے ہم ان سے بھی محروم اور تہی دامن ہیں۔ گویا ہم درحقیقت خلا میں ہیں کہ ہمارے نیچے وہ زمین ہی موجود نہیں ہے جس پر ایک قومی سیرت و کردار کی بنیاد پڑ سکے۔

محبت کے مثبت جذبے کے ضمن میں' میں نے عرض کیا تھا کہ قوم' وطن' نسل' زبان اور شخصیت سے ایک بلند تر محبت بھی انسانی ذہن و فکر نے اختراع کی ہے اور وہ ہے کسی نظریہ

(idealogy) اور کسی نظام کی محبت، جس کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ محبت دراصل انسان اور انسانیت کی محبت پر مبنی ہے۔ کسی نظامِ عدل کو قائم کرنے اور کسی معاشرے سے استحصال ختم کرنے کے لیے کوئی نظریہ اور کوئی نظام کسی کے دل میں جاگزیں ہوگیا ہے تو ایسے شخص کے دل میں اس نظام کو قائم کرنے کے لیے ایثار، قربانی، جدّوجہد اور کشمکش کا بے پایاں جذبہ اُبھرتا ہے۔ لہٰذا کسی نظریے اور کسی نظام کی محبت میں بھی سیرت و کردار کی تعمیر کی تاثیر موجود ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں ہمیں جہاد فی سبیل اللہ کی محبت دی گئی ہے۔ میں نے گزشتہ تقاریر میں سورۃ التوبہ کی آیت ۲۴ آپ کو سنائی تھی:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۴﴾﴾

ان تین محبتوں یعنی اللہ عزوجل کی محبت، اس کے رسول ﷺ کی محبت اور اس کی راہ میں جہاد کی محبت پر اگر علائق دنیوی کی پانچ محبتیں یعنی باپ، بیٹے، بھائی، بیویوں اور برادری کی محبتیں — یہ پانچ محبتیں علائق دنیا یعنی رشتہ داری سے متعلق ہیں جن کو علامہ اقبال نے ''رشتہ و پیوند'' سے تعبیر کیا ہے — اور سامانِ دنیا کی تین محبتیں یعنی مال، تجارت اور مکانات محبتیں — یہ تین محبتیں سامانِ دنیا اور متاعِ دنیا سے متعلق ہیں —— غالب آگئیں تو قرآن کریم کہتا ہے: جاؤ دفع ہو جاؤ اور انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ سنا دے، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ ایسے فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

لہٰذا اسلام نے یہ تین محبتیں تعمیرِ سیرت و کردار کے لیے مثبت جذبے کی اساسات کے طور پر عنایت کی ہیں اور آخرت کا خوف منفی جذبے کے طور پر دیا ہے۔ یعنی محاسبہ اُخروی اور اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہی کے لیے کھڑے ہونے کا خوف بھی تعمیرِ سیرت و کردار کے لیے ہے۔ سورۃ النازعات میں فرمایا: ﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿۴۰﴾ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿۴۱﴾﴾ ''اور جو کوئی ڈرتا رہا اپنے ربّ کے حضور کھڑا ہونے (کے خیال) سے اور اُس نے روکے رکھا اپنے نفس کو خواہشات سے، تو یقیناً اُس کا ٹھکانہ جنت ہی ہے''۔ پس اسلام نے تعمیرِ سیرت و کردار کے لیے دو بنیادیں انسان کو دی ہیں۔ پہلی بنیاد محبت

کی بنیاد ہے اور وہ ہے اللہ' اُس کے رسولؐ اور اُس کی راہ میں جہاد کی محبت' جو درحقیقت میری آج کی تقریر کا اہم موضوع ہے۔ دوسری بنیاد خوف کی بنیاد ہے اور وہ ہے محاسبۂ اخروی کا خوف۔ پھر یہی اساسات انسان کے ارادے کو تقویت فراہم کرتی ہیں۔

میں نے گزشتہ تقاریر میں عرض کیا تھا کہ ہمارے ہاں سیرت و کردار سازی کا ایک نظام طویل عرصے تک قائم اور جاری رہا ہے' جو بہت مؤثر اور کامیاب بھی رہا ہے' آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ اس نظام کا نقطہ آغاز لفظ ''ارادہ'' ہے' جس سے اسم فاعل ''مرید'' بنتا ہے یعنی وہ شخص جو ارادہ کر لیتا ہے۔ اصل میں وہ اپنے ارادے کی تقویت اور پختگی کے لیے کسی سلسلہ تصوف میں داخل ہوتا ہے اور وہاں سے کسبِ فیض کرتا ہے۔ لہٰذا انسان کے ارادے کی تقویت اس کی سیرت کی تعمیر میں بنیادی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔

تعمیرِ سیرت و کردار کی درمیانی سطح کے متعلق میں نے پچھلی تقاریر میں عرض کیا تھا کہ تعزیر و سزا' اوامر و نواہی اور احتساب سے بھی دنیا کے دوسرے نظاموں اور معاشروں میں خوف کا جذبہ پیدا کیا جاتا ہے' لیکن اگر یہ خوف اور مواخذہ' محاسبۂ اُخروی سے آزاد ہو تو اس میں بہت سے چور دروازے پیدا ہو جاتے ہیں اور تعزیرات کے اس نظام سے نہ صحیح عدل و انصاف میسر آتا ہے اور نہ ہی معاشرے کو امن و سکون حاصل ہوتا ہے۔ کرپشن اس کو بڑی حد تک غیر مؤثر بنا کر رکھ دیتی ہے۔ یہ چیز بالکل اظہر من الشمس ہے اور ہم میں سے اکثر و بیشتر کو اس کا علم بھی ہے اور تجربہ بھی ہے' لہٰذا مجھے تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسلام نے ایک طرف دُنیوی طور پر حدود و تعزیرات میں شدید ترین سزائیں رکھی ہیں' کہ اگر ایک شخص کو وہ سزا مل جائے تو ہزاروں کے چھکّے چھوٹ جائیں۔ یہ بھی یقیناً اسلامی نظام کا ایک اہم جزو ہے' لیکن اسلام اپنے ماننے والوں کے قلوب و اذہان میں اصل خوف آخرت کا جاگزیں کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے میں گزشتہ تقاریر میں قرآن مجید کی متعدد آیات پیش کر چکا ہوں۔ حدود و تعزیرات پر مبنی نظام تو معاشرے میں حقیقی امن و امان کی فضا قائم رکھنے کے لیے تجویز کیا گیا ہے اور درحقیقت اس طرح ایک اضافی خوف معاشرے کو دیا گیا ہے' ورنہ حقیقت نفس الامری کے اعتبار سے اصل خوف' خوفِ آخرت ہی ہے۔

اصلاحِ معاشرہ کی چوٹی

یہ وہ باتیں ہیں جن پر میں اپنے گزشتہ دو خطاباتِ جمعہ میں تفصیل سے گفتگو کر چکا ہوں

اور صرف ربط قائم کرنے کے لیے بطور تمہید و تذکیر میں نے ان کا آج پھر سے اعادہ کیا ہے۔لیکن آج مجھے تعمیرِ سیرت و کردار کے ذروۂ سنام یعنی چوٹی والی سطح پر اظہارِ خیال کرنا ہے۔وہ چوٹی والی بات یہ ہے کہ کسی بھی معاشرے میں جو نظامِ اجتماعی قائم ہے' وہ اگر انصاف اور عدل و قسط پر مبنی نہیں ہے تو اس معاشرے میں نہ تو اصلاح کی کوئی شکل پیدا ہو سکتی ہے اور نہ ہی اصلاح کی کوئی کوشش کامیاب ہو سکتی ہے۔اس لیے کہ ناانصافی' ظلم اور عدوان سے انسان میں منفی جذبات پیدا ہوتے ہیں' اس سے دلوں میں کدورت اور نفرت وجود میں آتی ہے اور عداوت اور انتقام کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ایسے معاشرے میں مثبت اور تعمیری فضا موجود نہیں ہوتی کہ جس کے ذریعے سے تعمیرِ سیرت و کردار کے لائحہ عمل کو غذا حاصل ہو سکے۔اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی پودا زمین سے سر نکالے تو اس کے پھلنے پھولنے کے لیے جہاں بیج کا صالح ہونا اور زمین کا زرخیز ہونا ضروری ہے وہاں اس کو وہ فضا بھی لازماً درکار ہے جو اس کو غذا دے اور اس کی نشوونما کے لیے سازگار ہو۔اگر یہ فضا میسر نہیں ہے تو پودا پروان چڑھنے کے بجائے مرجھا جائے گا۔بالکل یہی مثال اس نظام کی ہے جو بالفعل قائم و نافذ ہے۔اگر وہ نظام انصاف اور عدل و قسط پر مبنی نظام نہیں ہے تو وہ نفرت کو جنم دے گا' اس سے منفی احساسات وجود میں آئیں گے' اس سے عداوت اور انتقام کے جذبات پیدا ہوں گے۔اس سے صالح اور تعمیری جذبات کسی طور پر بھی پروان نہ چڑھ سکیں گے۔

اس ضمن میں سورۃ المائدۃ کی وہ آیت ذرا ذہن میں لائیے جو خمر (شراب) اور میسر (قمار' جوا) کے بارے میں آخری آیت ہے: ﴿اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَۃَ وَالْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ﴾ (آیت ۹۱) ''شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ تمہارے درمیان دشمنی اور بغض پیدا کر دے شراب اور جوئے کے ذریعے سے''۔یعنی یہ بات شیطان کے ہتھکنڈوں میں سے ہے کہ وہ تمہارے درمیان کدورت و نفرت اور عداوت و انتقام کے جذبات پیدا کرے۔شیطان یہ کام شراب اور جوئے کے ذریعے بھی لیتا ہے اور غیر منصفانہ اور غیر عادلانہ نظامِ حکومت کے ذریعے بھی۔ایسا نظام جس میں غیر منصفانہ نظامِ معیشت' اونچ نیچ اور استحصال موجود ہو تو شیطان ان وجوہ کی بنا پر بھی بہت بڑے پیمانے پر اکثریت کے ذہنوں میں محرومیوں کا احساس اور نفرت و دشمنی کے جذبات پیدا کرتا ہے اور اس طرح ان تمام اصلاحی کوششوں پر پانی پھیر دیتا ہے جو محض دھڑکی اصلاح کے لیے کی جا رہی ہوں اور جن میں نہ پیر

کی طرف کوئی توجہ ہو اور نہ سر کی طرف۔

موجودہ دور میں وعظ صرف اس وجہ سے غیر مؤثر نہیں ہو گئے کہ واعظوں میں' اِلّا ماشاء اللہ' کردار کی بلندی نہیں رہی۔ یہ بھی ایک سبب ہے' لیکن صورتِ واقعہ یہ ہے کہ اگر وعظ و نصیحت سے کہیں کوئی جذبہ اُبھرتا بھی ہے تو ماحول اس کو پنپنے نہیں دیتا۔ اس لیے کہ قدم قدم پر ظلم اور تعدّی ہے' قدم قدم پر استحصال ہے' قدم قدم پر ناانصافی ہے' رشوت ہے' جابرانہ رویہ اور سلوک ہے۔ پورے ماحول پر گھٹن کی فضا طاری ہے۔ تقریباً پورا نظام' عدل وقسط سے تہی دامن اور تہی دست ہے۔ ایسے حالات میں انسان میں جو ردِعمل پیدا ہوتا ہے اور معاشرے کی جو کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اس کو علامہ اقبال نے ایک شعر میں یوں تعبیر کیا ہے:

آرزو اول تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں
اور ہو جائے تو مرجاتی ہے یا رہتی ہے خام!

اس لیے کہ وہ ماحول اور نظام اسے غذا نہیں دے رہا ہوتا۔

تمیز بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے!

اس ظلم و عدوان کے نتیجے میں معاشرہ منقسم ہو جایا کرتا ہے۔ مراعات یافتہ (haves) اور محروم (have nots)' ظالم و مظلوم اور بندہ و آقا پر مشتمل طبقات بالقوہ وجود میں آجاتے ہیں۔ ایک غیر منصفانہ نظام کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مختلف طبقات کے لیے یہ مختلف اصطلاحات ہیں' لیکن ذہن میں رکھیے کہ اس مفہوم کے لیے قرآن حکیم کی اپنی اصطلاحات ہیں اور وہ ہیں مُسْتَکْبِرِیْن اور مُسْتَضْعَفِیْن۔ یہ دو طبقات جس معاشرے میں وجود میں آجائیں تو تباہی و بربادی اس کا مقدر ہے —— چاہے وہ کسی راستے سے اور کسی سبب سے آئے ہوں۔ خواہ وہ سیاسی محرومی اور دباؤ (political repression) کی وجہ سے آئے ہوں' خواہ وہ حریت و آزادی کو سلب کرنے والے جبر و استبداد کے باعث آئے ہوں' خواہ معاشی استحصال (economic exploitation) کے راستے سے یہ صورت پیدا ہوئی ہو' خواہ وہ سماجی اور معاشرتی اونچ نیچ اور ناروا امتیازات (discrimination) کی وجہ سے وجود میں آئے ہوں اور معیارات یہ بن گئے ہوں کہ سید زادہ بہرحال اونچا ہے خواہ وہ کتنا ہی بدکردار کیوں نہ ہو اور دوسرے مصلّی ہیں' کم تر ہیں' خواہ وہ سیرت کے لحاظ سے کتنے بلند کیوں نہ ہوں۔ یہ برہمن اور شودر کی تقسیم یا اعلیٰ و ادنیٰ نسل کی تقسیم' ان تمام اسباب کی بنا پر لازماً معاشرے میں طبقات وجود

میں آتے ہیں اور پھر یہ طبقات در طبقات میں تقسیم ہوتے چلے جاتے ہیں۔

میں نے طبقاتی تقسیم کی رائج الوقت بیشتر اصطلاحات آپ کے سامنے رکھی ہیں۔ ان کے مقابلے میں قرآن مجید کی ان دو اصطلاحات مُسْتَکْبِرِیْن اور مُسْتَضْعَفِیْن کو پیش نظر رکھیے تو قرآن کا یہ اعجاز سامنے آئے گا کہ ان دونوں اصطلاحات کی جامعیت اور گھمبیرتا یہ ہے کہ یہ رائج الوقت تمام اصطلاحات کا احاطہ کر رہی ہیں۔ ان میں مراعات یافتہ اور محروم طبقات (haves and have nots) کا تصور بھی موجود ہے' ان میں تمیز بندہ و آقا کا تصور بھی موجود ہے اور ان میں ظالم اور مظلوم کا تصور بھی موجود ہے۔ چنانچہ اب ذرا سنئے' سورۃ القصص میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ﴾ (آیت ۴) ''یقیناً فرعون نے بہت سرکشی کی تھی زمین (مصر) میں اور اُس نے تقسیم کر دیا تھا اس کے باسیوں کو گروہوں میں (اور) اس نے دبا رکھا تھا ان میں سے ایک گروہ کو۔''

ظالمانہ اور غیر منصفانہ نظام کا ایک نتیجہ وہ نکلتا ہے جس کی طرف بڑی شرح وبسط کے ساتھ امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے رہنمائی کی کہ انسانوں کی ایک عظیم اکثریت ڈھور ڈنگر بن جاتی ہے۔ قرآن مجید میں بھی غیر مبہم اور واضح الفاظ میں اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ انسانوں کی عظیم اکثریت جانوروں اور حیوانوں کی سطح تک گر جاتی ہے۔ فرمایا: ﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ﴾ (الاعراف: ۱۷۹) ''اُن کے دل ہیں مگر اُن سے سمجھتے نہیں' اور ان کی آنکھیں ہیں لیکن اُن سے دیکھتے نہیں' اور ان کے کان ہیں مگر ان سے سنتے نہیں۔ وہ بالکل چوپاؤں کے مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ اور گئے گزرے ہیں''۔ یہ نتیجہ ہوتا ہے ظلم وعدوان اور مستبدانہ و جابرانہ نظام کا جو انسان کی خودی کے احساس اور عزتِ نفس کو کچل دینے والی شے ہے۔ غیر عادلانہ و غیر منصفانہ نظام' ظلم و تعدّی والا نظام exploitation and repression والا نظام آدمی میں ''انسان'' ہونے کے احساس و شعور کو مار دیتا ہے جو اس کی سیرت کی تعمیر کے لیے بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر انسان ہونے کا شعور و احساس نہیں ہے تو اسے قرآن حکیم نے اس دنیا کی بہت بڑی نقد سزا سے تعبیر کیا ہے۔ فرمایا: ﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ؕ﴾ (الحشر: ۲۰) ''اور ان لوگوں کے مانند نہ ہو جاؤ جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے ان کو اپنے آپ سے غافل کر دیا''۔ یعنی وہ اپنے ''انسان''

ہونے کے ادراک سے محروم ہو گئے تو اللہ نے بھی انہیں اپنے آپ سے غافل کر دیا۔ ظاہر بات ہے کہ اپنی عظمت سے غافل انسان معاشرے میں ترفع کیسے حاصل کرے گا اور اس میں بلندی کی طرف بڑھنے کا جذبہ کیسے پیدا ہو گا؟ اسی کو شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی کتاب فلسفہ اکتشافات میں بہت صحیح لکھا ہے کہ ظلم و تعدی پر مبنی نظام کے تحت رہنے والے اکثر لوگ بالکل ڈھور ڈنگر کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ ان میں اعلیٰ احساسات اور اعلیٰ جذبات کے لیے سرے سے کوئی امکان اور گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر.....

اس سے بھی آگے جو بات آتی ہے' جس کے لیے میں آگے چل کر قرآن مجید سے استشہاد کروں گا' وہ یہ ہے کہ استحصالی طبقات' وہ لوگ جنہوں نے اپنی خدائی کا تخت جمایا ہوتا ہے' وہ لوگ جو معاشرے کو جونک کی طرح چوس رہے ہوتے ہیں اور عوام کی اکثریت کا خون ان کی رگوں میں دوڑ رہا ہوتا ہے' یہ لوگ عوام الناس کو طرح طرح کے بہلاوے دے کر غافل کیے رکھتے ہیں۔ ان کے لیے طرح طرح کے مشغلے تلاش کرتے ہیں۔ وہ ذرائع ابلاغ سے لوگوں کے سفلی جذبات کو ہوا دیتے رہتے ہیں اور انہیں لہو و لعب میں مشغول رکھتے ہیں —— تقریباً اس آیت کے مصداق:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝﴾

''اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو کھیل تماشے کی چیزیں خریدتے ہیں تاکہ گمراہ کریں (لوگوں کو) اللہ کے راستے سے بغیر علم کے' اور اس کو ہنسی بنالیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے اہانت آمیز عذاب ہے۔''

اس استحصالی گروہ کی سر توڑ کوشش یہی ہوتی ہے کہ لوگ کھیل تماشوں میں ہی گم' مگن اور مست رہیں۔ وہ سینما ہوں' ٹیلی ویژن کے ڈرامے اور رانگ و رنگ کے پروگرام ہوں' مختلف موضوعات کے اشتہارات ہوں' رقص و سرود کی محفلیں ہوں' یا وہ آرٹ کونسلیں ہوں۔ آپ دیکھئے کہ ذرائع ابلاغ پر تفریح کے نام سے ''لہو الحدیث'' کا جو طوفان آیا ہوا ہے' یہ سب کا سب دراصل اس لیے ہے کہ عوام الناس کو ان کے حقیقی مسائل سے گریزاں رکھا جائے۔ ان میں اپنے حقوق و فرائض کا ادراک و شعور پیدا نہ ہونے پائے۔ وہ دیکھ اور سمجھ نہ پائیں کہ وہ کس

استحصالی نظام میں کولہو کے بیل کی طرح جتے ہوئے ہیں۔ اصل حقائق ان کی نگاہوں سے اوجھل رہیں۔ وہ ان چیزوں سے بالکل غافل رہیں کہ معاشرے میں ہو کیا رہا ہے۔ کون کس پر ظلم کر رہا ہے' کون کس کا خون چوس رہا ہے' کون ان کے حقوق غصب کر رہا ہے۔ یہ سارے ہتھکنڈے علامہ اقبال کے اس شعر کے مصداق ہیں کہ ؎

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری!

اور ع ''کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں'' کے مصداق انسان کے حیوانی و سفلی جذبات کو مشتعل کرنے کے لیے یہ کھلونے کہیں آرٹ اور ثقافت کے نام پر دیے جائیں گے' کہیں مساواتِ مرد و زن کے دلفریب نظریے کی آڑ لے کر عورت کو اشتہاری اور بازاری جنس کے طور پر کھلونا بنایا جائے گا۔ چادر و چہار دیواری کا نام لے کر اسی کے تقدس کو پامال کیا جائے گا۔ لہو ولعب اور لغو و عبث مشاغل کے لیے نئے نئے دل فریب و دل آویز نام اور لیبل ایجاد کیے جائیں گے۔ یہ سب اس لیے کہ عوام الناس کی عظیم ترین اکثریت کو انہی میں مست اور مگن رکھا جائے تاکہ وہ کسی وقت بھی اصل حقائق کی طرف متوجہ ہونے ہی نہ پائیں۔

مستضعفین اور مستکبرین کا مکالمہ

یہی وہ بات ہے جس کے لیے میں نے آگے چل کر قرآن مجید سے استشہاد کا ذکر کیا تھا۔ سورۂ سبا میں قیامت کا نقشہ کھینچا گیا ہے: ﴿یَقُوْلُ الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْا لَوْلَآ اَنْتُمْ لَکُنَّا مُؤْمِنِیْنَ ﴿۳۱﴾﴾ یہ مستضعفین' یہ دبائے اور غافل رکھے ہوئے عوام قیامت کے دن مستکبرین سے کہیں گے کہ اگر تم نہ ہوتے تو یقیناً ہم سیدھی راہ پر آ جاتے۔ ہم بھی ایمان کی راہ' خیر کی راہ' اور عمل صالح کی راہ پر گامزن ہوتے۔ یہ تم ہی ہو جنہوں نے ہمیں راہِ راست سے روکا ہے' یہ تم ہی ہو جنہوں نے ہمیں مست اور مگن کیے رکھا ہے۔ اس کے جواب میں مستکبرین کیا کہیں گے' ذرا توجہ سے ان کا جواب سنئے —— یہ اسی نوع کا جواب ہے جو مستکبر اعلیٰ و اوّل ابلیس لعین قیامت کے دن اپنے پیروکاروں کو دے گا: ﴿وَمَا کَانَ لِیَ عَلَیْکُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُکُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِیْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِیْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَکُمْ ؕ﴾ (ابراھیم: ۲۲) کہ تم پر میرا کوئی زور تو تھا نہیں۔ میں نے تو اپنے راستے کو خوش نما دکھا کر بس تمہیں اس کی طرف بلایا تھا'

اس دلفریب ولذت کوش راستے کو دیکھ کر دیوانے تو تم خود بنے تھے اور اس کی طرف خود لپکے تھے۔ لہٰذا جرم تمہارا اپنا ہے' خطا تمہاری اپنی ہے تو مجھے کیوں ملامت کرتے ہو؟ ملامت کرنی ہے تو اپنے آپ کو اور اپنے نفس امارہ کو کرو۔ بالکل یہی بات وہ مستکبرین کہیں گے: ﴿اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ﴿۳۲﴾﴾ ''کیا ہم نے تمہیں ہدایت سے روکا تھا' اس کے بعد کہ وہ تمہارے پاس آ گئی تھی؟ بلکہ تم خود ہی مجرم تھے''۔ یہ تو تمہاری اپنی شیطنت اور اپنی خباثت تھی جس کا دنیا میں ظہور ہوا ہے' تم خواہ مخواہ ہمیں الزام دے رہے ہو۔

اُس وقت یہ مستضعفین' یہ غافلین ان مستکبرین کو کہیں گے: ﴿بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَآ اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَنَجْعَلَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ﴾ (آیت ۳۳) ''بلکہ یہ (تمہاری) رات دن کی سازشیں تھیں جب تم ہمیں حکم دیتے تھے کہ ہم اللہ کا کفر کریں اور اس کے لیے مدِ مقابل ٹھہرائیں''۔ یہ تو شب و روز کی وہ شاطرانہ اور مکارانہ چال تھی' جس میں تم لوگوں نے ہمیں پھانس رکھا تھا۔ یہ تمہارے ہی مشورے تھے جن کے باعث ہم نے اللہ کی نازل کردہ ہدایت کی ناقدری کی اور کفرانِ نعمت کی روش اختیار کی۔ ہم نے ان کھیل تماشوں اور باطل نظریات میں اُلجھ کر ان کو اللہ (کی محبت) کا ہمسر ٹھہرا لیا اور ہم دبے ہوئے ہونے کے باعث لہو ولعب اور باطل نظریات کے طلسم میں' جو تم لوگوں نے اپنے ذاتی مفاد کے لیے گھڑ رکھا تھا' گرفتار ہو کر ہم اپنی راہ کھوٹی کر بیٹھے۔

دیکھئے ان آیات میں تین مرتبہ اِسْتَكْبَرُوْا اور اُسْتُضْعِفُوْا آیا ہے' یعنی مستکبرین اور مستضعفین کا بار بار اعادہ ہو رہا ہے تاکہ یہ اصطلاحات اچھی طرح ذہن نشین ہو جائیں۔ اصل میں یہی وہ طبقاتی تقسیم ہے جو ظلم وعدوان پر مبنی اور غیر منصفانہ اور غیر عادلانہ نظام میں وجود میں آتی ہے' اور جب تک اس کو ختم نہیں کیا جائے گا' جب تک مبنی برقسط وعدل نظام قائم نہیں کیا جائے گا اصلاحِ معاشرہ کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ اس قسم کی تحریکوں اور کوششوں سے تھوڑے بہت اثرات پیدا ہو جائیں' نیچے نیچے کچھ خیر وفلاح اور کچھ بھلائی کے سوئے ہوئے جذبات کروٹ لیں' لیکن نتیجہ وہی نکلے گا جو علامہ اقبال کے اس شعر کے ذریعے میں آپ کے سامنے رکھ چکا ہوں کہ ؎

آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں
اور ہو جائے تو مرجاتی ہے یا رہتی ہے خام!

مستبدانہ و جابرانہ نظام اور استحصالی ماحول میں خیر و صلاح کی آرزو اوّل تو پیدا ہونی ہی مشکل ہے اور اگر پیدا ہو جائے تو ایسے معاشرے میں وہ پھل پھول اور پنپ نہیں سکتی۔ تو اس طبقاتی تقسیم کے لیے قرآن مجید کی اپنی اصطلاحات مستکبرین اور مستضعفین کا اعادہ کر کے اور ٹھونک ٹھونک کر انہیں ذہنوں میں بٹھانا مقصود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تین آیات میں ان کو تکرار و اعادہ کے ساتھ لایا گیا ہے۔

قرآن کا مرکزی پیغام: نظامِ عدل وقسط کا قیام

اسی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ اس طبقاتی تقسیم کو ختم کرنے کے لیے نظامِ عدل وقسط کا قیام ہی قرآن حکیم کی تعلیمات کا مرکزی پیغام ہے۔ نیکی کا راہبانہ تصور، نیکی کا علائق دنیا سے کنارہ کش ہونے اور نفس کشی کا وہ تصور جو عیسائیت، بدھ مت اور ہندو دھرم میں ہے، نیکی کا وہ تصور جو تصوف کے نام سے خود ہمارے ہاں رائج ہو گیا ہے، جو دراصل نو افلاطونی تصوف ہے، ان تصورات سے ہٹ کر اسلام کا تصورِ نیکی کیا ہے اور سب سے بڑی نیکی کیا ہے؟ وہ عُروۃ الوثقٰی کون سا ہے جو نیکی کے لیے سہارا بنتا ہے؟ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ وہ ہے نظامِ عدل وقسط کا قیام۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سب سے پہلے سورۂ آل عمران میں اللہ تعالیٰ کی یہ شان بیان ہوئی ہے: ﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ﴾ (آیت ۱۸) ''اللہ خود گواہ ہے کہ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور سارے فرشتے اور اہلِ علم بھی (اس پر گواہ ہیں)، وہ عدل وقسط کا قائم کرنے والا ہے''۔ اللہ کی صفت ہے کہ وہ عادل ہے اور وہ عدل وقسط کا قائم کرنے اور نافذ کرنے والا ہے۔ اس میں بھی ایک اپیل ہے کہ اگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی محبت فی الواقع دل میں پیدا ہو گئی ہو تو ''تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ'' کے مصداق اللہ تعالیٰ کی صفت عدل کا ایک پَرتو ہم اپنے اندر بھی پیدا کریں۔

اس سے آگے چلئے، سورۃ النساء اور سورۃ المائدۃ میں (لفظی ترتیب کے فرق کے ساتھ) اہل ایمان کے لیے انتہائی زوردار انداز میں یہ مضمون وارد ہوا ہے۔ سورۃ النساء میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ﴾ (آیت ۱۳۵) ''اے اہل ایمان! کھڑے ہو جاؤ پوری قوت کے ساتھ عدل کو قائم کرنے کے لیے اللہ کے گواہ بن کر''۔ قَوَّامٌ، فَعَّالٌ کے وزن پر مبالغے کا صیغہ ہے۔ اس کے معنی ہوں گے کہ عدل وانصاف کو پورے

اہتمام کے ساتھ اور اپنی پوری توانائیوں اور قوتوں کے ساتھ قائم کرو۔ آیت کے اس ٹکڑے میں ﴿شُهَدَآءَ لِلّٰهِ﴾ کو ایک بالکل علیحدہ بات بھی مان سکتے ہیں' اس اعتبار سے کہ اللہ خود ﴿قَآئِمًا بِالْقِسْطِ﴾ ہے۔ لہٰذا اس کے لیے شہادت یہ ہوگی کہ اس کے قسط کے نظام کو اس دنیا میں قائم کیا جائے۔ جسے اقبال نے کہا ہے ع ''دے تو بھی محمد ﷺ کی صداقت کی گواہی''۔ تو اللہ کے ﴿قَآئِمًا بِالْقِسْطِ﴾ ہونے کی اہل ایمان کے لیے بایں طور اور بایں صورت گواہی دینا فرض ہے کہ وہ دنیا میں اس نظامِ عدل وقسط کو قائم کریں۔

سورۃ المائدۃ میں یہی مضمون ذرا سی لفظی تبدیلی کے ساتھ یوں آیا ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ﴾ (آیت ۸)۔ آپ ان دونوں آیات کی لفظی ترتیب کو مدنظر رکھیں تو یہ عجیب بات معلوم ہوگی کہ ''اللہ'' اور ''قسط'' گویا ہم معنی اور مترادف الفاظ ہیں۔ ایک جگہ حکم ہے ''گواہ بن جاؤ اللہ کے'' اور دوسری جگہ فرمایا: ''گواہ بن جاؤ قسط کے۔'' ایک جگہ فرمایا: ''کھڑے ہو جاؤ قسط (عدل وانصاف) کے لیے'' جبکہ دوسری جگہ ارشاد ہوا کہ ''کھڑے ہو جاؤ اللہ کے لیے''۔ معلوم ہوا کہ اللہ اور قسط کے الفاظ جو ایک دوسرے کی جگہ آئے ہیں' آپس میں مترادف ہیں اور اس طرح دونوں کے ایک دوسرے کی جگہ آنے سے ان کے باہم لازم وملزوم ہونے کا تصور تو کم از کم سامنے آجاتا ہے۔

بعثتِ انبیاء ورسل علیہم السلام کا مقصد

اس سے آگے چلیے' سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ پر غور کیجیے جس کی آغاز میں تلاوت کی گئی تھی۔ یہ قرآن مجید کی بڑی عظیم اور بڑی اہم آیت ہے۔ بعث انبیاء ورسل علیہم السلام کی بنیادی غرض وغایت کیا ہے؟ انزالِ کتب کا مقصد کیا ہے؟ اور اس طرح کے دوسرے بہت سے اہم سوالات کے جوابات اس آیت میں دیے گئے ہیں۔ اس موقع پر یہ بات ذہن میں رکھیے کہ ایک غرض و غایت اس دنیا کے لیے ہے اور ایک غرض وغایت اُخروی ہے۔ میں اس وقت جو بات واضح کرنا چاہتا ہوں وہ بعث انبیاء ورسل علیہم السلام اور انزالِ کُتب کی اس غرض وغایت سے متعلق ہے جو اس دنیا سے تعلق رکھتی ہے جو سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ میں بیان ہوئی ہے۔

اب میں اس آیت کی تشریح وتوضیح کی کوشش کرتا ہوں۔ فرمایا: ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ﴾ ''بلاشبہ اور بالتحقیق ہم نے اپنے رسولوں کو بھیجا بینات کے ساتھ''۔ بَیِّن عربی زبان میں واضح اور روشن چیز کو کہتے ہیں۔ چنانچہ بَیِّنَات کو روشن دلائل بھی کہا جا سکتا ہے اور معجزات

بھی جو انبیاء و رُسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کو عطا کیے گئے۔ ﴿وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ﴾ ''اور ان کے ساتھ ہم نے اتاری کتاب اور میزان۔'' یہ کتاب اور میزان کس لیے اتاری؟ اس کی غرض و غایت اور مقصد کو آیت کے اگلے حصے میں خوب کھول کر بیان کر دیا گیا: ﴿لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ﴾ ''تاکہ بنی نوع انسان عدل و قسط پر قائم ہوں''۔ آیت کے اس مختصر سے حصے میں بعثتِ انبیاء و رسل کی غرض و غایت کا لُبِّ لُباب آ گیا۔

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے جتنے بھی رسول بھیجے تو ان کے ساتھ تین چیزیں نازل کی گئیں: (۱) بینات یعنی واضح اور روشن دلائل، معجزات، نشانیاں اور ہدایات۔ (۲) کتاب، جس میں روشن دلائل بھی ہیں اور وہ تعلیمات بھی مذکور ہیں جو انسان کی ہدایت کے لیے درکار تھیں تاکہ لوگ اس کی طرف رجوع کر سکیں۔ (۳) میزان، یعنی وہ شریعت، وہ نظام اور وہ معیارِ حق و باطل اتارا جو ٹھیک ٹھیک تول کر یہ بتا دے کہ انسانی معاشرے میں حقوق و فرائض کا توازن کیا ہے! افکار و نظریات میں حق کیا ہے، باطل کیا ہے! اخلاق اور دنیوی تمام معاملات میں افراط و تفریط کے مختلف نقطہ ہائے نظر کی مختلف انتہاؤں کے درمیان عدل و انصاف اور قسط کی راہ کون سی ہے! میں عرض کیا کرتا ہوں کہ قرآن حکیم کا یہ مستقل اسلوب ہے کہ وہ اہم مضامین کو کم سے کم دو مرتبہ ضرور بیان کرتا ہے۔ چنانچہ کتاب اور میزان کے انزال کا ایک مرتبہ ذکر سورۃ الحدید میں آیا ہے اور یہی بات سورۃ الشوریٰ کی سترہویں آیت کی ابتدا میں فرمائی گئی: ﴿اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ۭ﴾ ''اللہ ہی ہے جس نے اتاری ہے کتاب بھی اور میزان بھی حق کے ساتھ۔''

اب غور کیجیے کہ اگر میزان نصب نہ ہو تو اس کا اتارنا، معاذ اللہ، عبث قرار پائے گا، حالانکہ سورۂ آلِ عمران میں واضح طور پر فرما دیا گیا: ﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ﴾ (آیت ۱۹۱) ''اے ہمارے ربّ! تو نے یہ سب کچھ بے مقصد پیدا نہیں کیا ہے''۔ اب یہ میزان اگر نصب نہ ہو تو بیکار ہے۔ اگر اس میں تول کر نہ دیا جا رہا ہو، جس کو بھی کچھ دیا جا رہا ہو، تو یہ ناانصافی ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حقوق و فرائض کے جو ضوابط مقرر کیے ہیں اگر وہ بالفعل نافذ نہیں، تو محض ان کی تلاوت کرنے سے ثواب تو مل جائے گا، لیکن اس کی غرض و غایت تو پوری نہیں ہوگی۔ کتاب اور میزان تو نازل ہی اس لیے کی گئی ہے تاکہ بنی نوع انسان عدل و قسط پر قائم ہوں۔ سورۃ الحدید کی یہ آیت قرآن مجید کی بڑی گھمبیر آیت ہے اور اس آیت کی مکمل

شرح پوری سورۃ الصّف ہے۔

آگے اس آیت میں فرمایا گیا: ﴿وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ﴾ ''اور ہم نے لوہا بھی اتارا ہے'' ﴿فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ﴾ ''اس میں جنگ کی صلاحیت ہے''۔ اس میں ظالموں کی سرکوبی اور ان کا سر کچلنے کی استعداد ہے — اسی حوالے سے سورۃ الصّف میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝۴﴾ ''اللہ کو تو محبوب ہیں وہ بندے جو اُس کی راہ میں صفیں باندھ کر قتال کرتے ہیں' گویا کہ وہ سیسہ پلائی دیوار ہوں'' — آگے فرمایا: ﴿وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ ''اور اس (لوہے) میں لوگوں کے لیے فائدے بھی ہیں'' مثلاً اس سے گھریلو استعمال کی چیزیں توا' چمٹا وغیرہ اور بہت سی مشینیں اور بہت سے اوزار بھی بنتے ہیں جو انسان کی تمدنی ضروریات پوری کرتے ہیں' لیکن اس کی اصل قوت اسلحہ ہے اور اس میں جنگ کی صلاحیت ہے۔ یہ اس لیے ہے: ﴿وَلِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَیْبِ ؕ﴾ ''اور تا کہ اللہ جان لے کہ کون مدد کرتا ہے اُس کی اور اُس کے رسولوں کی غیب میں ہونے کے باوجود''۔ اللہ جان لینا چاہتا ہے' یعنی ظاہر کر دینا چاہتا ہے' جانچ لینا چاہتا ہے کہ کون ہیں اس کے وہ وفادار بندے جو اس لوہے کی طاقت کو ہاتھ میں لے کر اس کی مدد کرتے ہیں' درآں حالیکہ وہ اس سے غیب میں ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان کے سامنے نہیں ہے' اس کے باوجود وہ محبت الٰہی سے سرشار ہو کر اس نظامِ عدل وقسط کو قائم کرنے کی جدوجہد کرتے ہیں جو اللہ نے نازل فرمایا ہے' اور اُس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں جن کی وساطت سے وہ نظام نوعِ انسانی کو عطا ہوا ہے۔ سورۃ الصّف میں تو اس کے لیے براہِ راست حکم آیا ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْۤا اَنْصَارَ اللّٰهِ﴾ (آیت ۱۴) ''اے اہلِ ایمان! اللہ کے مددگار بن جاؤ۔''

آیت کے آخر میں فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۝۲۵﴾ ''یقیناً اللہ بہت قوت والا' بہت زبردست ہے''۔ یعنی اس کو تمہاری مدد کی قطعی حاجت نہیں۔ تم سے جو نصرت کا مطالبہ ہے' وہ تمہارے امتحان کے لیے ہے' جس کی بنا پر تم عدالتِ اُخروی میں سرخرو ہو گے۔

بعثتِ محمدی ﷺ کی غرض وغایت

سورۃ الحدید کی آیت میں تو ایک قاعدہ کلیہ بیان ہوا ہے: ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ﴾ لیکن اس کے جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر خصوصی انطباق (particular application) کے متعلق سورۃ الشوریٰ کی

پندرہویں آیت میں ذکر کیا گیا ہے جس کی میں نے آغاز میں تلاوت کی تھی' فرمایا کہ: ﴿فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ﴾ ''اے (محمد ﷺ!) آپ اسی ـــ ﴿اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ﴾ (آیت ۱۳) ''کہ قائم کرو دین کو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو'' ـــ کی دعوت دیتے چلے جایئے اور جمے رہیے جیسا کہ آپ کو حکم دیا گیا ہے اور ان (مستکبرین' معاندین' مخالفین' اور کفار و مشرکین) کی خواہشات کی پیروی (اور پروا) ہرگز نہ کیجئے''۔ ﴿قُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ﴾ ''آپ برملا کہہ دیجیے کہ میرا یقین تو اس کتاب پر ہے جو اللہ نے نازل فرمائی ہے'' ﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ؕ﴾ ''اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے مابین (نظام) عدل قائم کروں''۔ یعنی مجھے محض ایک واعظ نہ سمجھ لینا' محض ایک مبلّغ نہ خیال کر لینا جو ایک وعظ کہہ کے اور کچھ تبلیغ کر کے تحسین کے ڈونگرے وصول کرتا ہے اور پھر اگلی بستی کی راہ لیتا ہے۔ اگر تم اس مغالطے میں مبتلا ہو تو اسے دور کرو۔ چونکہ تم نے حقیقت نفس الامری کا ادراک کیا ہی نہیں' اس لیے اب اچھی طرح جان لو کہ میری بعثت کا تکمیلی مقصد یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ دین (المیزان) یعنی نظام عدل و قسط بالفعل قائم و نافذ کروں۔ میں اس بات پر مامور من اللہ ہوں کہ ظالم کا ہاتھ روک دوں' مظلوم کی فریاد رسی کروں۔ نظام زندگی کو عدوان اور استحصال سے پاک صاف کروں اور وہ نظامِ عدل و قسط برپا کروں جس میں جس کو جو کچھ ملے عدل و انصاف کے مطابق ملے' اور کوئی شخص اور کوئی طبقہ کسی کے حقوق پر دست درازی نہ کر سکے۔

نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا یہ تکمیلی مقصد قرآن حکیم میں ایک دوسرے اسلوب سے ایک شوشے کے تغیر کے بغیر قرآن حکیم کی تین سورتوں (التوبۃ: ۳۳' الفتح: ۲۸' الصّف: ۹) میں بایں الفاظ واضح فرمایا گیا ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ ''وہی تو ہے جس نے بھیجا ہے اپنے رسول (ﷺ) کو الہدیٰ اور دین حق دے کر تاکہ غالب کر دے اسے کُل کے کُل دین (نظامِ زندگی) پر''۔ غور فرمایئے سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ اور سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۷ دونوں کا جامع و مانع اسلوب کے ساتھ اس آیت مبارکہ میں ذکر آ گیا۔ بعثتِ رسول کا ذکر بھی موجود ہے۔ ''کتاب'' کی جگہ ''ھُدًی'' کا لفظ آ گیا جو کتابِ الٰہی ہی کا ایک توصیفی نام ہے۔ المیزان اور نظام عدل و قسط کی جگہ ''دین الحق'' کی اصطلاح آ گئی جو اس ضمن میں قرآن مجید کی جامع ترین اصطلاح ہے جس میں وہ تمام مفاہیم بھی شامل ہیں جو

المیزان' اور عدل وقسط کی تشریح وتوضیح میں ہمارے سامنے آئے ہیں۔ الغرض ﴿لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ اور ﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ﴾ کے جملہ مفاہیم ﴿لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ میں آ گئے۔

بعثتِ محمد ﷺ کی تکمیلی شان

آگے بڑھنے سے پہلے میں ایک بات کی وضاحت کرنا چاہوں گا کہ اظْهَارُ دِيْنِ الحَقِّ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا تکمیلی مرحلہ ہے اور یہ وہ منصب ہے جو آنحضور ﷺ کے سوا کسی نبی یا رسول کو فرضِ منصبی کے طور پر عطا نہیں ہوا۔ گویا اس مقدس جماعت کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ نظامِ عدل وقسط کے قیام کی سعی اور جدوجہد کرے' لیکن اس کام کو تکمیلی شان تک پہنچانا بذاتِ خود نبی اکرم ﷺ کا منصب قرار دیا گیا اور پھر آنحضور ﷺ نے اپنی حیاتِ طیبہ میں جزیرہ نمائے عرب کی حد تک اظْهَارُ دِيْنِ الحَقِّ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ کے حکم کی تعمیل فرما دی۔

ویسے تو تمام انبیاء ورسل علیہم السلام کی طرح نبی اکرم ﷺ شاہد بھی تھے اور شہید بھی' مبشّر بھی تھے اور نذیر بھی' داعی الی الخیر بھی تھے اور مبلّغ بھی' مذکّر بھی تھے اور واعظ بھی' مربّی بھی تھے اور مزکّی بھی' معلّم بھی تھے اور مدرّس بھی' رحمت بھی تھے اور رأفت بھی ـــــ الغرض یہ جملہ شانیں بھی بتمام وکمال نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ میں موجود تھیں' لیکن آنحضور ﷺ کی امتیازی شان اظْهَارُ دِيْنِ الحَقِّ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ہے اور آپ ﷺ نے تئیس (۲۳) سالہ جان گسل محنت ومشقت جھیل کر اس دینِ حق اور نظامِ عدل وقسط کو جزیرہ نمائے عرب میں بالفعل قائم فرما دیا اور اس طرح امرِ الٰہی ﴿اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ﴾ کی کُلّی طور پر تعمیل فرما دی۔

اس موقع پر یہ بات ذہن میں رکھیے کہ آنحضور ﷺ اور آپؐ کے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے یہ نظام ''حدید'' کی قوت سے قائم کیا۔ اسی لیے مدینۃ النبیؐ میں تمکن کے بعد آپ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی زندگیوں میں ''غزوات'' کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ محض دعوت و تبلیغ سے نظامِ عدل وقسط کبھی قائم نہیں ہوسکتا۔ اگر ہوسکتا ہوتا تو حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ قائم کر کے دکھاتے' لیکن تاریخ انسانی میں اس کی کوئی مثال موجود نہیں ہے کہ محض دعوت وتبلیغ سے کوئی نظام بنیاد سے لے کر چوٹی تک تبدیل ہو جائے۔ انقلابات محض وعظ ونصیحت سے نہیں آیا کرتے' بلکہ اس کے لیے انقلابی جدوجہد ناگزیر ہے' جس میں صبر و مصابرت

(passive resistance) سے لے کر اقدام (active resistance) اور مسلح تصادم (armed conflict) کے تمام مراحل سے گزرنا لازم اور لابدمنہ ہے۔ دعوت وتبلیغ اور وعظ و نصیحت سے چند لوگوں کی سیرت واخلاق تو درست ہو سکتے ہیں اور ان کی انفرادی زندگیوں میں تھوڑا سا نکھار آ سکتا ہے، لیکن نظامِ عدل وقسط قائم نہیں ہو سکتا۔

نفاذِ نظامِ عدل میں رکاوٹ کون؟

جب بھی کسی معاشرے میں نظامِ عدل وقسط کے قیام کے لیے جدوجہد کا آغاز ہوتا ہے تو اس راستے میں ان طبقات کی طرف سے شدید ترین مزاحمت ہوتی ہے جن کا شمار haves میں ہوتا ہے۔ یہ وہ مراعات یافتہ طبقات (privileged classes) ہیں، جنہوں نے لوگوں کا خون چوسا ہوتا ہے اور چوس رہے ہوتے ہیں اور جن کے مفادات (vested interests) رائج ظالمانہ اور غیر عادلانہ نظام سے وابستہ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ کبھی اس کو گوارا نہیں کر سکتے کہ نظامِ عدل وقسط قائم ہو۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ سے فرمایا گیا کہ آپ اس نظام کے نفاذ میں کافروں اور مشرکوں کی ناگواری کا خیال مت کیجیے: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ (التوبۃ) ''وہی تو ہے جس نے بھیجا اپنے رسول (ﷺ) کو الہدیٰ اور دین حق دے کر تاکہ غالب کر دے اسے کُل کے کُل دین (نظامِ زندگی) پر، خواہ یہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار گزرے''۔ سورۃ الشوریٰ میں فرمایا گیا: ﴿اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ۭ﴾ (آیت ۱۳) ''قائم کرو دین کو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔ (اے نبی ﷺ) بہت بھاری ہے مشرکین پر یہ بات جس کی طرف آپ ان کو بلا رہے ہیں''۔ یعنی مشرکین کی ناگواری اور ان کی مزاحمت ومخالفت کے علی الرغم نظامِ عدل وقسط اور دینِ حق کے قیام کے لیے آپ کو جدوجہد کرنی ہے، اور اس کام کے لیے آپ کو ''حدید'' کی قوت عطا کی گئی اور جنگ وقتال کو فرض قرار دیا گیا:

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـــًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـــًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۭ﴾ (البقرۃ:۲۱۶)

''(مسلمانو!) اب تم پر جنگ فرض کر دی گئی ہے اور وہ تمہیں گراں گزر رہی ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی شے کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو۔ اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو درآنحالیکہ وہی تمہارے لیے بُری ہو۔''

پھر اس قتال فی سبیل اللہ اور قیامِ نظامِ عدل وقسط کی خاطر قتال کی اہمیت کے بارے میں سورۃ الصّف میں فرمادیا گیا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝۴﴾ ''اللہ کو تو محبوب ہیں وہ بندے جو اُس کی راہ میں صفیں باندھ کر قتال کرتے ہیں' جیسے کہ وہ سیسہ پلائی دیوار ہوں' اور سورۃ المائدۃ میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝۴۲﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

نظامِ عدل وقسط کی اہمیت اور اس کی برکات

جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے یہ نظامِ عدل وقسط قائم کر کے دکھایا ہے جس کی برکات سیرتِ مطہرہ اور تاریخ کے مطالعہ سے روزِ روشن کی طرح ہمارے سامنے آتی ہیں کہ کس طرح سماجی اونچ نیچ ختم ہوئی' کس طرح تمام بنی نوعِ نسان ایک سطح پر آ گئے اور اس فرمانِ رسولؐ کا مکمل نقشہ چشمِ فلک نے دیکھا: ((كُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا))(۱)۔ مزید یہ کہ حضور ﷺ کے اس ارشاد کی عملی تصویر نوعِ انسانی نے دنیا میں اجتماعی طور پر پہلی بار دیکھی:

((يَا اَيُّهَا النَّاسُ! اَلَا اِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ وَاِنَّ اَبَاكُمْ وَاحِدٌ ، اَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى اَعْجَمِيٍّ، وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ، وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰى اَسْوَدَ، وَلَا اَسْوَدَ عَلٰى اَحْمَرَ ، اِلَّا بِالتَّقْوٰى))(۲)

''لوگو! آگاہ ہو جاؤ' یقیناً تمہارا ربّ ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے۔ خبردار! نہ کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت حاصل ہے اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر' اور نہ کسی سرخ وسفید رنگت والے کو کسی سیاہ فام پر کوئی فضیلت حاصل ہے اور نہ کسی سیاہ فام کو کسی سرخ وسفید رنگت والے پر' مگر تقویٰ کے لحاظ سے۔''

بقول علامہ اقبال مرحوم ع ''تمیز بندہ وآقا فسادِ آدمیت ہے'' —— اور

كُلُّ مُؤْمِنٍ اِخْوَةٌ اندر دلش حریت سرمایۂ آب و گلش
ناشکیبِ امتیازات آمدہ در نہادِ او مساوات آمدہ

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الادب' باب ما ینهی عن التحاسد والتدابر۔ وصحیح مسلم' کتاب البر والصلة والآداب' باب تحریم التحاسد والتباغض والتدابر۔

(۲) مسند احمد' ح ۲۲۹۷۸' شعب الایمان للبیهقی ۱۸۲۰/٤۔ صحیح الترغیب للالبانی' ح ۲۹٦٤۔ راوی: جابر بن عبد اللّٰه الانصاری رضی اللہ عنہ۔

یہ مساوات سماجی مساوات ہے' اس کو جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے قائم کیا ہے اور اس شان سے قائم کیا ہے کہ جب بنی مخزوم کی ایک سارقہ — جس پر قطع ید کی سزا کے نفاذ کا حضور ﷺ فیصلہ فرما چکے تھے — کے لیے آپؐ کے پاس سفارشات پہنچیں تو آنحضور ﷺ نے فرمایا: ((وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِہٖ لَوْ اَنَّ فَاطِمَۃَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ یَدَھَا))(۳) ''اللہ کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے' اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اُس کا ہاتھ بھی لازماً کاٹتا۔''

رسول اللہ ﷺ نے کیسا نظام برپا کیا تھا' اس کے بارے میں جاننے کے لیے بیعت خلافت کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پہلے خطبے کے اس ارشاد کو ذہنوں میں تازہ کیجیے: ''لوگو! تم میں سے ہر قوی شخص میرے نزدیک بہت کمزور ہوگا جب تک کہ میں اس سے کسی کا حق وصول نہ کرلوں اور تم میں سے ہر کمزور شخص میرے نزدیک بہت قوی ہوگا جب تک کہ میں اُسے اس کا حق نہ دلوا دوں''۔ یہ ارشاد درحقیقت تدبیر مملکت پر مبنی وہ بیان (policy statement) ہے جو خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کی غرض وغایت کو واضح کر رہا ہے۔ پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا وہ تاریخی جملہ یاد کیجیے کہ آپؓ کو خوف ہے کہ ''اگر دریائے فرات کے کنارے کوئی کُتّا بھی بھوک سے مر گیا تو آخرت میں مجھ سے مواخذہ نہ ہو جائے!'' اُمت کے دو گلہائے سرسبد کے احساسات وتاثرات میں یہ شدت اس لیے تھی کہ نبی اکرم ﷺ کو نظام عدل وقسط قائم کرنے کا حکم دیا گیا تھا: ﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ ؕ﴾ (الشوریٰ:۱۵) اور آپ ﷺ کی بعثت کا امتیازی وتکمیلی مقصد ''اِظھارُ دِیْنِ الْحَقِّ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ'' تھا۔ خلافت راشدہ درحقیقت نبوتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا تسلسل اور تتمہ وتکملہ تھی' اسی لیے اُسے خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خلفائے راشدین کے احساسات بھی نظامِ عدل وقسط کے حوالے سے بہت شدید تھے۔

اس ضمن میں حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ کے وہ الفاظ بھی بہت اہم ہیں جو آپؓ نے ایرانی افواج کے سپہ سالار رستم کو مخاطب کرتے ہوئے کہے تھے۔ قادسیہ کے محاذ پر اسلامی افواج کے سپہ سالار حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے جنگ سے پہلے ایرانیوں کے ساتھ مذاکرات کے لیے حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ کو بھیجا تھا۔ رستم نے ان سے سوال کیا تھا کہ تم لوگ یہاں کیا لینے آئے ہو؟ اس پر انہوں نے اپنے مشن کی وضاحت ان الفاظ میں کی تھی:

---

(۳) صحیح البخاری' کتاب المغازی' باب منہ۔

اِنَّ اللّٰہ ابتعثنا لنخرج العباد من عبادۃ العباد الی عبادۃ ربِّ العباد' ومن ضیق الدُّنیا الی سِعَۃ الآخرۃ ومن جور الادیان الی عدل الاسلام

''ہمیں اللہ نے بھیجا ہے تا کہ ہم بندوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر بندوں کے رب کی غلامی میں لے آئیں' اور انہیں دنیا کی تنگی سے نکال کر آخرت کی کشادگی سے ہم کنار کریں' اور باطل نظاموں سے نجات دلا کر اسلام کے عادلانہ نظام سے روشناس کرائیں۔''

اصلاحِ معاشرہ اور نظامِ عدل وقسط کا باہمی تعلق

یہ بات ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ قرآن مجید کے نزدیک نظامِ عدل وقسط کے قیام کی اہمیت کیا ہے۔ اس کا میرے آج کے موضوع سے جو تعلق ہے اُسے پھر ذہن میں تازہ کر لیجیے کہ اصلاحِ معاشرہ کی کوئی کوشش اُس معاشرے میں بار آور نہیں ہو سکتی جس میں ظلم' ناانصافی اور عدوان کا دور دورہ ہوگا۔ اس لیے کہ یہ تو بے چینی کو جنم دینے والے عوامل (factors) ہیں اور ان سے لوگوں کی ایک عظیم اکثریت ڈھور ڈنگروں کی سطح تک گرا دی جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں حساس لوگوں میں انتقام کی آگ بھڑکتی ہے' ان کے جذبات مشتعل ہوتے ہیں اور ان کے دل انتقام کی آگ کی بھٹیاں بن جاتے ہیں۔

اگر کسی معاشرہ میں معاشی عدم وتفاوت اور ناانصافی پر مبنی ایسا نظام رائج ہوگا تو پھر وہاں دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں: یا تو بے حسی اتنی غالب ہو جائے گی کہ لوگ ڈھور ڈنگر بن جائیں گے یا اس کا ردِّ عمل یہ ہوگا کہ حساس لوگ باغی اور منتقم بن کر اقتدارِ وقت اور استحصالی طبقات کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے اور آتش وخون کے دریا بہیں گے۔ ظالمانہ اور استحصالی نظام میں وہ فضا کسی صورت پیدا نہیں ہو سکتی جو خیر' بھلائی' مثبت کردار اور تعمیرِ سیرت واخلاق کے لیے سازگار ہو۔

اس موقع پر میں علامہ اقبال کے وہ اشعار آپ کو سنا دینا ضروری سمجھتا ہوں جن کے بارے میں آج میرے دل میں ایک عجیب احساس جاگا۔ وہ یہ کہ جیسے امام شافعیؒ نے سورۃ العصر کے بارے میں فرمایا تھا: لَوْ لَمْ یُنَزَّلْ مِنَ الْقُرْآنِ سِوَاھَا لَکَفَتِ النَّاسَ ''اگر قرآن مجید میں اس سورۂ مبارکہ کے سوا اور کچھ بھی نازل نہ ہوتا تو صرف یہ سورت ہی لوگوں (کی ہدایت) کے لیے کافی ہوتی'' —— میں بلاتشبیہ عرض کر رہا ہوں کہ اگر علامہ اقبال کا کوئی کلام نہ ہوتا سوائے ان اشعار کے تو یہ اشعار ان کی عظمت کا لوہا تسلیم کرانے کے لیے کافی ہوتے۔

ان اشعار میں علامہ کے فکر کی بلندی انتہا تک پہنچی ہوئی نظر آتی ہے اور ہمارے سامنے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ پیرِ رومی کا یہ مریدِ ہندی آیاتِ قرآنیہ اور ان کے مطالب و مفاہیم کو کس آب و تاب اور شان سے اپنے اشعار میں بیان کر رہا ہے۔ علامہ فرماتے ہیں: ؎

چیست قرآں ' خواجہ را پیغامِ مرگ
دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ
ہیچ خیر از مردکِ زرکش مجو
لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا

اس شعر کا دوسرا مصرع قرآنی آیت کے الفاظ پر مشتمل ہے —— ان اشعار میں علامہ نے یہ پیغام دیا ہے کہ جانتے ہو قرآن کی حقیقت کیا ہے؟ یہ سرمایہ دار کے لیے موت کا پیغام اور بے سروسامان لوگوں کے لیے سہارا و آسرا ہے۔ زراندوزی کرنے والے اور مال سے محبت کرنے والے بندے سے کسی خیر کی توقع نہ کرو۔ (چاہے اس کے پاس حج اور عمروں کے انبار موجود ہوں' چاہے تہجدوں کی کثرت ہو' چاہے کتنی ہی مفروضہ اور نفلی عبادات ہوں۔) اس لیے کہ قرآن کا فتویٰ یہ ہے: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ط﴾ (آلِ عمران:۹۲) ''تم ہرگز نہیں پہنچ سکتے نیکی کے مقام کو جب تک کہ خرچ نہ کرو اس میں سے جو تمہیں پسند ہے۔''

اصلاحِ معاشرہ کے لیے معاشی ناانصافی کا خاتمہ ضروری ہے

علامہ اقبال نے ہمارے رائج الوقت نظامِ حیات کے معاشی پہلو پر شدید تنقید کی ہے —— ہمارے نظامِ معیشت کے دو ستون ہیں: ایک کاروبار یا صنعت و حرفت' دوسرا مزارعت۔ ان دونوں کی بنیاد میں ربا (سود) رچا بسا ہوا ہے۔ مزارعت کی رائج الوقت صورت کو جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے ربا قرار دیا ہے۔ آپ ﷺ نے مزارعت کا معاملہ کرنے والوں سے فرمایا: ((قَدْ اَرْبَیْتُمَا، فَرُدَّ الْاَرْضَ اِلٰی اَھْلِھَا وَخُذْ نَفَقَتَكَ)) (٤) ''تم لوگوں نے ربا کا معاملہ کیا ہے' تم زمین اس کے مالکوں کو واپس کر دو اور اپنا خرچہ لے لو''۔ مزارعت کی یہ صورت کہ بٹائی پر زمین زراعت کے لیے دی جائے اور اگر فصل کسی وجہ سے برباد ہو جائے تو مالک زمین کا حبّہ برابر نقصان نہیں ہوگا' جبکہ مزارع خالی ہاتھ رہ جائے گا' اس کی ساری محنت اکارت جائے گی اور وہ مزید زیر بار ہو جائے گا —— مزارعت کی اس قسم کے بارے میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ قطعیت کے

(٤) سنن ابی داوٗد' کتاب البیوع' باب فی التشدید فی ذالك۔

ساتھ کہتے ہیں کہ یہ حرام مطلق ہے۔امام مالک رحمۃ اللہ علیہ بھی اسے قطعیت کے ساتھ حرام مطلق قرار دیتے ہیں‘ جبکہ قاضی ابو یوسف‘ امام محمداور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم اس کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں۔اس کی ایک وجہ ہے۔

لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس جاوید اقبال صاحب‘ جو علامہ کے فرزند ارجمند ہیں‘ نے حال ہی میں ایک تقریر میں بڑی صحیح بات کہی ہے کہ ہمارے ہاں بھی قانونِ ضرورت واحتیاج (Law of Necessity) کارفرما رہا ہے۔اس قانون نے جہاں ملوکیت کو سندِ جواز عطا کی ہے وہیں زمینداری اور جاگیرداری کو بھی سندِ جواز عطا کر دی ہے۔اس لیے کہ جب وہ نظام عملاً برپا ہو گیا تو اب کیا کریں؟ جب فوج اقتدار پر قابض ہو گئی تو کون سی سپریم کورٹ ہے جو اس سے اقتدار چھین سکتی ہو! ایسے حالات میں تو نظریۂ ضرورت کے تحت اسے سندِ جواز دینی ہی پڑے گی‘ چاہے اُسے مشروط ہی کیوں نہ کر دیا جائے۔ پھر ان شرائط کی پروا آخر کون کرے گا؟ اور اگر کوئی نہ کرے تو کون مائی کا لال ہو گا جو ان شرائط پر عمل درآمد کرنے پر کسی فوجی آمر کو مجبور کر سکے۔(۵) اسی طرح جب جاگیرداری اور زمینداری معاشرے میں عملاً رواج پا گئی تو قاضی ابو یوسفؒ‘ امام محمدؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کیا کریں؟ یہ متاخرین ہیں‘ جبکہ مقدم الذکر دو حضرات چوٹی کے لوگ ہیں‘ جن کو اساتذۂ کرام کا مقام حاصل ہے‘ جو امام الائمہ کا رتبہ رکھتے ہیں — ہمارے ہاں فقہ کا وہ مکتب جو عموماً قیاس ورائے پر مبنی سمجھا جاتا ہے اس کے رجل اعظم یقیناً امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں اور باقی آنے والے انہی کے خوشہ چین ہیں۔ دوسری طرف حدیث رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر مبنی فقہ میں الفضل للمتقدمین کے اعتبار سے اوّلیت واقدمیت امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ کے لیے ہے۔مزید یہ کہ امام مالکؒ امام دارالھجرۃ اور امام مدینۃ الرسول ہیں اور اہل مدینہ کا تعامل بھی ہمارے فقہاء کے نزدیک ایک سند کی حیثیت رکھتا ہے — یہ دونوں امام مزارعت کی حرمت پر متفق ہیں۔ چنانچہ صرف لین دین اور کاروباری سود کو آپ ربا نہ سمجھئے‘ بلکہ علامہ کا وہ شعر‘ جو ابھی میں آپ کو سنانے والا ہوں اس میں جس ربا کا ذکر ہے اس میں رائج الوقت مزارعت کو بھی شامل سمجھئے۔ میں نے شعر سنانے سے قبل اس کی قدرے تفصیل سے شرح کر دی ہے۔علامہ فرماتے ہیں: ؎

---

(۵) ڈاکٹر صاحب کا یہ خطاب ۱۲/ نومبر ۱۹۸۲ء کا ہے۔اس وقت جنرل ضیاء الحق کا مارشل لاء کا دور تھا‘ جسے سپریم کورٹ نے ’’نظریۂ ضرورت‘‘ کے تحت جائز قرار دے دیا تھا۔ (مرتب)

از ربا آخر چہ می زاید؟ فتن!
کس نداند لذتِ قرضِ حسن
از ربا جاں تیرہ' دل چوں خشت و سنگ
آدمی درّندہ بے دندان و چنگ

''سود سے سوائے فساد کے اور کس چیز میں اضافہ ہوسکتا ہے؟ افسوس کہ بغیر سود قرض دینے کی لذت کسی کو معلوم نہیں۔ سود سے روح تاریک اور دل اینٹ پتھر کی طرح سخت ہو جاتا ہے اور انسان بغیر دانتوں اور پنجوں کے درندہ بن جاتا ہے۔''

یہاں اس شہر لاہور میں ایک مردِ درویش مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ رہے ہیں' جن کا ایک کشف میں آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔ انہیں یہ کشف ایک دوسرے درویش کے ذریعے سے حاصل ہوا تھا۔ یہ مولانا کا وہ زمانہ ہے جب ان کو انگریزی سامراج نے لاہور میں نظر بند کر رکھا تھا۔ مولانا بتاتے ہیں کہ میں ایک روز کشمیری بازار میں گھوم رہا تھا کہ ایک خستہ حال درویش مجھ سے ملا اور اس نے مجھ سے کہا کہ ''مجھے کسی انسان کا پتا دو' میں اس سے ملنا چاہتا ہوں''۔ مولانا نے اپنی نوجوانی کی لا اُبالی کیفیت میں جواب دیا کہ ''تم کو اس بھرے بازار میں انسان نظر نہیں آتے؟ کندھے سے کندھا چھل رہا ہے' کھوے سے کھوا ٹکرا رہا ہے اور تم انسان تلاش کر رہے ہو؟'' اس درویش نے کہا: ''کہاں ہیں انسان؟ مجھے تو کہیں انسان نظر نہیں آ رہے!'' مولانا احمد علیؒ فرماتے ہیں کہ مجھ پر بھی اس وقت یہ کیفیت طاری ہوئی کہ مجھے یہ مشاہدہ ہوا کہ کسی دوکان پر خنزیر بیٹھا ہوا ہے' کہیں کوئی بھیڑیا ہے اور کہیں کوئی ریچھ ہے' سب کے سب درندے تھے' جو درحقیقت انسان کے لبادے میں براجمان تھے۔ یہی بات ہے جو علامہ اپنے اس شعر میں کہہ رہے ہیں: ''آدمی درّندہ بے دندان و چنگ!'' — آگے علامہ کہتے ہیں:

رزقِ خود را از زمیں بردن رواست
ایں متاعِ بندہ و ملک خداست
بندۂ مومن ایں' حق مالک است
غیر حق ہر شے کہ بینی' ہالک است
رأیتِ حق از ملوک آمد نگوں
قریہ ہا از دخلِ شاں خوار و زبوں

آب و نانِ ماست از یک مائدہ
دودۂ آدم کَنَفْسٍ وَّاحِدہ(۶)

میں ان اشعار کے ترجمے اور تشریح کے بجائے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ معاش کا مسئلہ یقیناً بہت اہم ہے اور اگر کسی معاشرے اور نظام میں معاشی عدل قائم نہ ہو تو انسان سب سے زیادہ اس ناانصافی سے متاثر ہوتا ہے۔ اسی لیے علامہ اقبال نے یہاں تک کہہ دیا ہے: ؎

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتہ شرعِ مبیں این است و بس(۷)

اگر کسی کی شخصی آزادی اور حریت کچلی جا رہی ہو تو وہ بھی بڑی ناانصافی ہے۔ چنانچہ دورِ فاروقی میں ایک گورنر ـــــ گورنر بھی کون! فاتح ایران' یکے از عشرہ مبشرہ' حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ـــــ نے اپنے مکان کے باہر ایک ڈیوڑھی بنا لی تھی اور ایک پہریدار بٹھا دیا تھا۔ اس پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورہ سے اپنے قاصد کو یہ ہدایت دے کر بھیجا تھا کہ جا کر اس دیوڑھی کو آگ لگا دے اور پھر ایران کے گورنر کو امیر المؤمنین کی طرف سے یہ ڈانٹ سنائے کہ ''اے سعد! لوگوں کو ان کی ماؤں نے آزاد پیدا کیا تھا' تم نے ان کو اپنا غلام کیسے سمجھ لیا؟'' پس حریت کی راہ میں کوئی رکاوٹ بھی کسی درجہ میں پسندیدہ نہیں' لیکن یہ غیر منصفانہ معاشی تقسیم اور اس ضمن میں یہ ظالمانہ اور استحصالی نظام اور پھر اس کے نتیجے میں haves اور have nots کی طبقاتی تقسیم' مستکبرین اور مستضعفین کے طبقات کا عملی ظہور انسان کا شعور اور احساس اس کو بمشکل برداشت کرتا ہے۔ اسی لیے قرآن مجید میں مالِ فے کی تقسیم کا حکم دے کر واضح فرما دیا گیا: ﴿كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ﴾ (الحشر:۷) ''تا کہ دولت

---

(۶) زمین سے اپنے لیے رزق کا حصول جائز ہے' لیکن یہ انسان کے لیے صرف استعمال کی چیز ہے۔ ملکیت صرف خدا کی ہے۔ بندۂ مؤمن (اپنے مال و متاع کا صرف) امین ہے' مالک خدا ہے۔ خدا کے سوا جو کچھ دیکھتے ہو' سب فانی اور ہلاک ہو جانے والا ہے۔ حق کا پرچم بادشاہوں کے باعث نیچا ہو جاتا ہے اور ان کی وجہ سے بستیوں کی بستیاں خوار و بدحال ہو جاتی ہیں۔ ہمارا آب و دانہ ایک ہی دسترخوان سے ہے' اس لیے کہ آدم کا پورا خاندان ایک جان کی مانند ہے۔

(۷) شریعت حقہ اور نظامِ اسلامی کا اصل مقصود یہی ہے کہ دنیا میں کوئی کسی کا محتاج نہ رہے۔

تم میں سے مال داروں ہی کے درمیان گردش میں نہ رہے۔''

یہ قرآن حکیم کی اہم اصولی ہدایات میں سے ایک ہے جس میں اسلامی معاشی نظام کی معاشی پالیسی کا بنیادی ضابطہ اور قاعدہ بیان کیا گیا ہے کہ دولت معاشرے کے صرف مالداروں میں ہی نہ گھومتی رہے بلکہ ایسا معاشی نظام رائج و نافذ ہو کہ جس کے نتیجے میں دولت کی گردش پورے معاشرے میں عام ہو۔ اب خود فیصلہ کیجیے کہ قرآن کی اس ہدایت اور مقصد کے بالکل خلاف ایک معاشی نظام چل رہا ہو اور haves یعنی اغنیاء اور have nots یعنی فقراء کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی جارہی ہو' فرق و تفاوت اتنا بڑھ رہا ہو کہ تناسب ایک جگہ قائم رہنے کے بجائے روز تبدیل ہو رہا ہو تو اس معاشرے میں آخر وہ جذبات و خیالات اور احساسات کیسے پنپ سکیں گے جو خیر پر مبنی ہوں؟ ماحول اس کو غذا دینے کے لیے تیار نہ ہو' بلکہ وہ ہر اس جذبے کو کچلنے کے درپے ہو جس میں خیر کی کوئی رمق موجود ہو تو وہاں اصلاح کی کوئی کوشش کیسے کامیاب ہو سکے گی؟

اصلاحِ معاشرہ کے لیے انقلاب ناگزیر ہے!

اب سوال یہ ہے کہ ان حالات میں کیا کریں' ان کے بدلنے کی کوئی سبیل ہے بھی یا نہیں؟ یہ ہے میری آج کی گفتگو کا دوسرا حصہ۔ میں کئی بار یہ بات عرض کر چکا ہوں کہ اس کے لیے محض دعوت و تبلیغ اور وعظ و تلقین کی ضرورت نہیں ہے' بلکہ انقلاب کی ضرورت ہے۔ اس انقلاب سے مراد بھی اسلامی انقلاب ہے' محض ہاتھوں کو بدل دینے والا انقلاب نہیں' محض کسی شخص کو نفرت کا نشانہ بنا کر اس کی ٹانگیں کھینچنے والا انقلاب نہیں' محض ایک معاشی نعرے کی بنیاد پر برپا ہونے والا انقلاب نہیں۔ بلکہ اسلامی انقلاب مراد ہے جو اپنی بنیادوں پر استوار ہوگا' جو اپنی جڑ سے غذا حاصل کرے گا اور وہ بنیاد و اساس اور جڑ ایمان ہے۔ وہ ایمان و ایقان سے اصل قوت حاصل کرے گا اور پھر اس میں وہ سارے مراحل آئیں گے جو مراحل انقلابِ محمدی ﷺ میں تھے۔

اس ضمن میں یاد رکھیے کہ دو انتہاؤں سے بڑی احتیاط کے ساتھ بچنے کی ضرورت ہے۔ (۱) دین کا وہ تصورِ نیکی جس میں انقلاب کا تصور ہی شامل نہ ہو۔ وہ بھی شیطان کا ایک بہت بڑا پھندا ہے۔ (۲) انقلاب کا ایسا شیدائی ہو جانا کہ جیسا بھی انقلاب آئے' آئے ضرور۔ یہ بھی دراصل شیطان کا دوسرا اُتنا ہی بڑا پھندا ہے۔ انقلاب کا تصور ہو لیکن وہ سرتاسر انقلابِ محمدیؐ کا تصور ہو۔ وہ انقلاب کامل اسلامی انقلاب ہو۔ اس کے اپنے مقدمات پر اس کا آغاز ہو۔ اُسے اپنی جڑوں سے قوت حاصل ہو رہی ہو۔

انقلابی عمل کے لوازم و مراحل

وہ انقلاب کیا ہے اور خاص طور پر اس کا قرآن حکیم سے کیا تعلق ہے' آج کے موضوع کی مناسبت سے میں اب اس کو واضح کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے یہ باتیں کئی بار عرض کی ہیں اور آپ میں سے اکثر کے علم میں ہوں گی' لیکن جن کے علم میں نہ ہوں اُن کے لیے اختصار سے عرض کیے دیتا ہوں۔

میرے نزدیک کسی بھی انقلاب کے چھ مراحل ہیں' تین ابتدائی ہیں اور تین تکمیلی۔ ابتدائی تین مراحل یہ ہیں:

۱) **انقلابی نظریہ**: انقلابی عمل کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ کوئی ''انقلابی نظریہ'' موجود ہو اور اس کی نشر و اشاعت کا اہتمام ہو۔ محض وعظ کے ذریعے انقلاب نہیں آئے گا۔ نیکی کے اُن تصورات کے ذریعے جو عام طور پر دینی حلقوں میں رائج ہیں' انقلاب نہیں آئے گا۔ انقلاب تو وہیں آئے گا جہاں ایک انقلابی نظریہ رائج الوقت نظام کی جڑوں پر تیشہ چلا رہا ہو۔ اگر ایسا ہے تو انقلاب کا عمل ابتدائی طور پر جاری اور روشناس (initiate) ہوگا۔ اگر ایسا کوئی انقلابی نظریہ نہیں ہے تو پھر وہ انقلابی عمل نہیں ہوگا' بس ایک اصلاحی (reformatory) عمل ہوگا جس سے سماجی برائیوں کی اصلاح کا کام ہو جائے گا' کوئی علمی تحقیق کا کام ہو جائے گا' کچھ ذہنوں کی جلا کا کام ہو جائے گا۔ لیکن یہ سب کام ہرگز انقلابی کام شمار نہیں ہوں گے۔ انقلاب کے لیے تو ایک انقلابی نظریہ لازم و ناگزیر ہے۔ یہ ہے کسی بھی انقلاب کا پہلا اور بنیادی مرحلہ۔

۲) **تنظیم**: انقلابی عمل کا دوسرا مرحلہ یہ ہوگا کہ جو لوگ اس انقلابی نظریے کو قبول کر لیں انہیں ایک ہیئت اجتماعی کے تحت منظم کیا جائے۔ اس طرح ایک انقلابی جماعت وجود میں آئے۔ اس جماعت کے لیے دو چیزیں لازمی ہوں گی۔ اولاً یہ بڑی مضبوط ڈسپلن والی جماعت ہونی چاہیے' تاکہ معلوم ہو کہ یہ محض ہجوم (mob) نہیں ہے' بلکہ ایک مجتمع قوت ہے جس کو شکست دینا آسان نہیں ہے۔ ثانیاً یہ کہ اس تنظیم میں کارکنوں کی حیثیت اور مرتبے کا تعین تحریک کے ساتھ وفاداری اور قربانی کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔

۳) **تربیت**: انقلابی عمل کا تیسرا مرحلہ یہ ہوگا کہ جو لوگ اس انقلابی نظریے کو قبول کریں ان کی تربیت کا انتظام ہو۔ ظاہر بات ہے کہ یہ تربیت نظریے کے ساتھ ہم آہنگ ہونی ضروری ہے۔ نظریہ اگر کسی خالص مادی انقلاب کو جنم دینے والا ہے تو اس کے لیے تربیت بھی صرف

مادّی درکار ہوگی۔ اس کے لیے کسی رُوحانی اور اخلاقی تربیت کی کوئی ضرورت نہیں۔ ایسی کوئی قدغن مادّی انقلاب قبول کر ہی نہیں سکتا' بلکہ اسے احمقانہ قرار دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بالشوئزم کے حقیقی انقلابی نظریے میں جنسی پابندیوں (sex discipline) کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جس طرح ایک پیاسا انسان آزاد ہے کہ وہ اس جذبے کی جس طرح چاہے تسکین کر لے' اسی طرح کامریڈ مرد اور عورتیں آزاد ہیں کہ باہمی رضامندی سے جب چاہیں' جیسے چاہیں اپنے جنسی جذبے کی تسکین کا سامان کر لیں۔ اس طور پر جو اولاد ہوگی وہ ریاست کی ملکیت ہوگی اور ان کی پرورش ریاست کے ذمہ ہوگی۔ لیکن اسلامی نظام لانا ہے تو اس کی مناسبت سے اگر تربیت کا نظام نہیں ہے تو یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی' قدم آگے نہیں بڑھیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کسی اور کا کام انجام دے دیں۔ حالانکہ ہونا تو یہ چاہیے کہ ؎

کارِ خود کن کارِ بیگانہ مکن بر زمینِ دیگرے خانہ مکن!

کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم انقلاب کے شوق میں کسی اور کا کام کر رہے ہوں۔ اس لیے کہ اگر تربیت کے اس دوسرے مرحلے میں کتاب وسنت کا عطا کردہ تربیتی نصاب پیش نظر نہیں ہے تو پھر سارا انقلابی کام اسلامی انقلاب کا نہیں' کسی اور انقلاب کا کام ہے۔ ذرا نگاہِ بازگشت ڈالئے تو نظر آئے گا کہ ماضی میں یہی کچھ ہوتا رہا ہے۔ متحدہ محاذ بنے' بڑی قربانیاں دی گئیں' لیکن کام کن کا ہوا' نتائج کیا نکلے' تحریک کے ثمرات کس کی جھولی میں آئے؟ چنانچہ انقلاب کا دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ اس نظریے کو ماننے اور قبول کرنے والوں کا نظریے کے مطابق تربیت کا خاص انتظام واہتمام ہو۔

تصادم اور کشمکش کے تین مرحلے

یہ تین ابتدائی مراحل ہیں۔ ان کے بعد تین تکمیلی مراحل آتے ہیں' جن کے لیے ایک جامع عنوان ہے: ''تصادم اور کشمکش''۔ اس کے بھی آگے تین مرحلے ہیں:

۱) **صبر محض**: دراصل یہ مرحلہ انقلابی نظریے کی دعوت کے بعد خود بخود شروع ہو جائے گا۔ یہ کشمکش اور تصادم کا وہ دور ہے جس میں انقلابی کارکنوں کے لیے صبر وتحمل اور استقامت کی ضرورت ہے' کہ ماریں کھاؤ' ہاتھ نہ اُٹھاؤ! اگر اس ابتدائی دور میں کوئی انقلابی جماعت متشدد (violent) ہو جائے' جلد باز اور ناعاقبت اندیش ہو جائے تو کچل دی جائے گی اور ختم کر دی جائے گی۔ لہٰذا اس دور کے لیے حکم ہوتا ہے کہ ماریں کھاؤ' ظلم وتعدی برداشت کرو' لیکن تم کو کسی بھی جوابی اقدام اور کارروائی کی اجازت نہیں ہے۔ اصل میں یہ دور تھا جس سے حضرتِ

مسیح علیہ السلام کو سابقہ پیش آیا تھا۔ جو لوگ اس مرحلے کے تقاضوں کو نہیں سمجھتے وہ حضرت مسیحؑ پر زبانِ طعن دراز کر دیتے ہیں۔ آپؑ کی دعوت کا یہ دور صبرِ محض کا دور تھا اور پھر اس سے اگلا مرحلہ ان کی زندگی میں آیا ہی نہیں اور اللہ نے انہیں آسمان پر اُٹھا لیا۔ اس دور میں حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم و تلقین یہ تھی کہ ''اگر کوئی تمہارے دائیں گال پر تھپڑ مارے تو بایاں گال بھی سامنے کر دو۔ اگر کوئی نالش کر کے تمہارا جبہ لینا چاہے تو اپنا کرتہ بھی اس کے حوالے کر دو۔ اگر کوئی تمہیں بیگار میں ایک کوس لے جانا چاہے تو دو کوس جاؤ''۔ یہ صبر و مصابرت کا دور ہے جسے میں نے تصادم و کشمکش کا پہلا مرحلہ یعنی صبرِ محض (passive resistance) قرار دیا ہے۔

۲) راست اقدام: دوسرا دور وہ آتا ہے جب ایک قابل لحاظ جمعیت اور قوت فراہم ہو جاتی ہے اور وہ ماریں کھا کھا کر اور ظلم و جور کی بھٹی سے گزر کر کندن بن جاتی ہے۔ اب اقدام (Active Resistance) کا مرحلہ آتا ہے۔

۳) مسلح تصادم: انقلابی مراحل میں اقدام کے بعد آخری مرحلہ براہِ راست تصادم کا ہو گا۔ ظاہر ہے کہ جب اقدام ہو اور اس نظام کو کہیں سے چھیڑا جائے، کہیں سے اس کی کوئی دکھتی رگ دبائی جائے تو وہ نظام جوابی کارروائی (retaliate) ضرور کرے گا۔ ترکی بہ ترکی جواب دے گا اور اس اُبھرتی ہوئی انقلابی دعوت کو کچلنے کے درپے ہو جائے گا۔ یہیں سے تصادم و کشمکش کے تیسرے مرحلے ''مسلح تصادم'' (armed conflict) کا آغاز ہو جائے گا۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ اس کے بغیر کوئی انقلاب کبھی نہیں آیا۔ اگر آ سکتا ہوتا تو وہ انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہوتا۔

اسلامی انقلاب کے مراحل

ان چھ انقلابی مراحل کو سامنے رکھیے اور دیکھئے کہ ان مراحل کا اسلامی انقلاب کے مراحل پر انطباق (application) کس طور پر ہوتا ہے۔ میں اس موقع پر ابتدائی تین مراحل پر تو قدرے تفصیل سے کچھ عرض کروں گا، لیکن تکمیلی تین مراحل کا اجمالی ذکر کروں گا، اس لیے کہ ایک تو وقت محدود ہے اور دوسرے انقلاب کا تکمیلی اور آخری مرحلہ یعنی مسلح تصادم کافی وضاحت کا متقاضی ہے، جسے اتنے کم وقت میں بیان کرنا مشکل ہے۔ دراصل یہ معاملہ ہمارے اکثر جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے بڑا بھیانک اور ڈراؤنا ہے۔ پھر دو سو سال کی غلامی اور مغربی مستشرقین کے اس پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر کہ ''اسلام تلوار سے پھیلا ہے'' اور یہ کہ ع ''بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے!'' ہم نے معذرت خواہانہ (apologetic) رویہ اختیار کر لیا

ہے اور مسلح تصادم کے نام سے ہمارے اعصاب پر رعشہ طاری ہو جاتا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ کوئی بھی انقلاب تلوار اٹھائے بغیر نہیں آ سکتا اور انقلابِ محمدی ﷺ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ پھر قرآن حکیم میں قتال فی سبیل اللہ کی اہمیت سورۃ الصّف کی اس آیت میں واضح ہو جاتی ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝﴾۔

اسلام کا نظریۂ انقلاب: ''قرآن مجید''

بہر حال ذکر انقلاب کے ابتدائی مراحل کا تھا تو جان لیجیے کہ اسلام کا نظریہ انقلاب ہے: ''قرآن حکیم''۔ اب آگے اصطلاحات بدل جائیں گی اور مروّجہ اصطلاحات کی جگہ اسلامی اصطلاحات آئیں گی، مثلاً نشر و اشاعت کی جگہ دعوت و تبلیغ۔ مفہوم وہی رہے گا، بس اصطلاح کا نام بدل جائے گا — یہاں نظریۂ انقلاب کے لفظ سے مجھے علامہ اقبال کے چند اشعار بے ساختہ یاد آ گئے:

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں!
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں!

علامہ نے یہ تمام نظریات قرآن مجید سے اخذ کیے ہیں۔ درحقیقت روئے زمین پر قرآن حکیم سے بڑھ کر تو کجا اس سے کمتر بھی، ایک صالح انقلاب کے نظریے کی حامل کوئی دوسری کتاب موجود ہی نہیں ہے۔ یہ کتابِ مبین اعتقادات سے لے کر زندگی کے ہر معاملے، ہر پہلو اور ہر گوشے میں انقلاب کی داعی کتاب ہے۔ یہ کتاب ہر باطل نظریے اور ہر باطل فکر و عمل کے لیے تیغ عریاں ہے۔

قرآن حکیم کے یہ حقائق اس کے معروضی (objectively) مطالعہ سے منکشف ہوتے ہیں۔ محض پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے یا محض کوئی تحقیقی مقالہ لکھنے کی غرض سے اس کا جزوی مطالعہ یا صرف وعظ کہنے کے لیے اس کی چند آیات کو یاد کر لینے سے قرآن حکیم کے انقلابی نظریے، اس کے انقلابی پیغام، اس کی انقلابی دعوت اور اس کے انقلابی لائحہ عمل تک رسائی ہونا دشوار ہے۔ جب قرآن کی حقیقی تعلیمات کو سمجھنے کے لیے کوئی ارادہ ساتھ ہو گا — وہی ارادہ جہاں سے میں نے گفتگو شروع کی تھی، جہاں سے تعمیرِ سیرت و کردار کا پروگرام شروع ہوتا ہے — اگر وہ ارادہ فی الواقع ہو اور کہیں ''مرید'' وجود میں آ جائے جو چاہتا ہو کہ ہم قرآن مجید کو سمجھیں بھی اور اس پر عمل بھی کریں تو وہ جان لے کہ قرآن حکیم سے بڑھ کر دنیا میں

اور کوئی انقلابی کتاب نہیں۔ یہ بات وہ ہے جو غیروں نے کہی ہے' دشمنوں نے کہی ہے۔ ہم نے تو اس کے پَر ہر طرف سے کاٹ دیے ہیں۔ اس کے ساتھ جو تصورات وابستہ کیے ہیں وہ بس ایک مقدس کتاب کے ہیں۔ اس کا نظریہ اور اس کی انقلابیت ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے' لیکن دوسروں نے اس کو پالیا ہے۔ اسی شہر لاہور میں مشہور سوشلسٹ لیڈر ایم این رائے نے کہا تھا کہ ''قرآن سے بڑھ کر کوئی انقلابی کتاب نہیں اور محمد (ﷺ) سے بڑا تاریخِ انسانی میں کوئی انقلابی لیڈر نہیں''۔ اور شاید گلیڈسن یا لائیڈ جارج نے کہا تھا کہ ''جب تک دنیا میں قرآن موجود رہے گا دُنیا میں امن قائم نہیں ہوسکتا''۔ آریہ سماجی مشہور لیڈر سوامی شردھانند نے بھی قرآن کے بارے میں اسی نوع کا اظہارِ خیال کیا تھا۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے خوب اچھی طرح جان لیا تھا کہ قرآن محض ایک کتابِ مقدس ہی نہیں ہے' بلکہ سراسر ایک انقلابی نظریے کی حامل کتاب ہے اور انقلاب کے مراحل میں مسلّح تصادم ایک مسلّم حقیقت (established fact) کی حیثیت سے دنیا میں تسلیم کیا جاتا ہے۔

انہوں نے تو یہ بات تعصب اور مخالفت کے جذبے سے کہی تھی اور ان کا انداز بھی منفی (negative) ہے' لیکن یہ قرآن کو بہت بڑا خراجِ تحسین (tribute) ہے کہ یہ قرآن تو انسان کے اندر آگ بھر دیتا ہے' بشرطیکہ قرآن مجید کا راہنمائی حاصل کرنے کے لیے معروضی مطالعہ کیا جائے۔ کتنی پیاری بات کہی ہے علامہ اقبال نے:

پیشِ ما یک عالمِ فرسودہ است
ملّت اندر خوابِ اُو آسودہ است
رفت سوزِ سینہ تاتار و کُرو
یا مسلماں مرد یا قرآں بمُرد!(۸)

یہ ہوا کیا ہے؟ مسلمان مر گیا ہے یا قرآن میں تاثیر باقی نہیں رہی؟ قرآن نے تو اس سینہ گیتی پر تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب برپا کیا تھا۔ قرآن نے تو نوعِ انسانی کو وہ صالح نظام دیا تھا

---

(۸) ہمارے سامنے ایک پرانا اور گھسا پٹا عالَم ہے اور ملتِ اسلامی اس کی خاک نشینی ہی میں آسودگی محسوس کر رہی ہے۔ مسلمان اقوام مثلاً مغلوں اور کردوں کے سینے حرارت سے کیوں خالی ہو گئے؟ آیا مسلمان پر موت طاری ہو گئی ہے یا خود قرآن ہی کے حیات بخش سوتے خشک ہو گئے ہیں!

جس کی یاد انسان کے حافظے میں ایک سہانے خواب کے مانند ابھی تک موجود ہے۔

ہر کُجا بینی جہانِ رنگ و بو
زانکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است(۹)

انسان کا ذہن شعوری و غیر شعوری طور پر اس صالح نظام کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اس کی روح اس صالح نظام کی برکات سے اپنی تشنگی کو آسودگی سے بدلنے کے لیے بھٹک رہی ہے۔ انسانیت کے اجتماعی تحت الشعور میں یہ بات موجود ہے کہ ایک صالح نظام اس دنیا میں فی الواقع قائم ہو چکا ہے۔ یہ کوئی پریوں کی کہانی (fairy tale) نہیں ہے' بلکہ یہ ایک حقیقت ہے۔ یہ کوئی ماقبل تاریخی دور (pre historic era) کی بات نہیں ہے۔ یہ واقعہ تو تاریخ کے نصف النہار میں ظہور پذیر ہوا ہے۔ پس قرآن حکیم کا انقلابی نظریہ ہمارے پاس موجود ہے۔ اس ضمن میں علامہ کے یہ اشعار مجھے بلا ارادہ فی البدیہہ طور پر یاد آ رہے ہیں:

اے کہ می نازی بہ قرآنِ عظیم — تا کجا در حجرہ ہا باشی مقیم
در جہاں اَسرارِ دیں را فاش کن — نکتۂ شرعِ مبیں را فاش کن!

اے وہ شخص یا قوم جسے حاملِ قرآن عظیم ہونے پر فخر ہے! کب تک حجروں میں مقیم رہو گے اور قرآن پر ناز کرتے رہو گے؟ اٹھو اور دنیا میں دین حق کے اسرار و رموز کو عام کرو اور شریعت اسلامی کے رموز و حکم کی تشہیر و اشاعت کے لیے سرگرم ہو جاؤ! اس قرآن کے اسرار و رموز' اس کے عبر و حکم' اس کی رہنمائی و ہدایت' اس کے انقلابی تصورات و انقلابی دعوت اور اس کا پیغام آخر کب تک چھپے رہیں گے؟ انہیں منصۂ شہود پر آنا چاہیے۔

اسلامی انقلاب کے لیے قرآن حکیم کی اصطلاحات

دعوت و تبلیغ: اسلام کا نظریۂ انقلاب قرآن ہے اور اس کی نشر و اشاعت کے لیے قرآن حکیم کی بہت سی اصطلاحات ہیں۔ اس بارے میں یہ نوٹ کر لیجیے کہ اسلام کی جتنی بھی اصطلاحات ہیں' ان سب کا مرکز و محور' مبنیٰ و مدار قرآن اور صرف قرآن ہے۔ ان اصطلاحات

(۹) تم (آج) جہاں کہیں رنگ و بو کی وہ دنیا دیکھتے ہو جس کی خاک سے "آرزو" نشو و نما پاتی ہے' وہ یا تو نورِ مصطفیٰ سے روشن ہے یا اب تک تلاشِ مصطفیٰ ﷺ میں سرگرداں ہے۔

میں سب سے زیادہ کثیر الاستعمال اور عام فہم اصطلاح دعوت و تبلیغ ہے۔ تبلیغ سے مراد یہ نہیں ہے کہ اختلافی مسائل کی تبلیغ کی جائے۔ جیسے آج کل ''عظیم الشان تبلیغی کانفرنسیں'' منعقد ہو رہی ہیں' لیکن ان کا موضوع تبلیغِ اسلام اور قرآن نہیں' بلکہ رفع یدین اور آمین بالجہر جیسے اختلافی مسائل ہوتے ہیں یا نور و بشر جیسے موضوعات ہوتے ہیں۔

اس حوالے سے یاد رکھیے کہ تبلیغ سے مراد ہے قرآن مجید کی تبلیغ اور اسی کا حکم دیا گیا تھا رسول اللہ ﷺ کو: ﴿يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۭ﴾ (المائدۃ:٦٧) ''اے رسول (ﷺ) پہنچا دیجیے جو کچھ نازل کیا گیا ہے آپؐ کی طرف آپؐ کے رب کی جانب سے۔ اور اگر (بالفرض) آپؐ نے ایسا نہ کیا تو گویا آپؐ نے اُس کی رسالت کا حق ادا نہیں کیا''۔ یہی وہ بات تھی جس پر گواہی لی تھی حجۃ الوداع کے موقع پر نبی اکرم ﷺ نے ـــــ اس لیے کہ اللہ کے ہاں جا کر انہیں بھی جواب دینا تھا' وہ بھی مسئول تھے۔ اس ضمن میں سورۃ الاعراف کی آیت ٦ ذہن میں لائیے: ﴿فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝٦﴾ ''ہم تو پوچھیں گے ان سے بھی جن کی طرف رسولوں کو بھیجا گیا اور ان سے بھی جن کو رسول بنا کر بھیجا گیا''۔ یہ ہے وہ احساس جس کے لیے میدانِ عرفات میں نبی اکرم ﷺ نے تقریباً سوا لاکھ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے مجمع سے گواہی لی ہے: ((اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ؟)) لوگو سنو! کیا میں نے پہنچا دیا؟ اس پر پورے مجمع نے یک زبان ہو کر جواب دیا: نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّيْتَ وَنَصَحْتَ(١٠)۔ ایک روایت میں الفاظ آتے ہیں: اِنَّا نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ الرِّسَالَةَ وَاَدَّيْتَ الْاَمَانَةَ وَنَصَحْتَ الْاُمَّةَ وَكَشَفْتَ الْغُمَّةَ کہ ہاں ہم گواہ ہیں آپ ﷺ نے رسالت کا حق ادا کر دیا' آپؐ نے امانت کا حق ادا کر دیا (یہ قرآن آپؐ کے پاس اللہ کی امانت تھی جو آپؐ نے ہم تک پہنچا دی)' آپؐ نے اُمت کی خیر خواہی کا حق ادا کر دیا اور آپؐ نے گمراہی اور ضلالت کے اندھیروں کا پردہ چاک کر دیا ـــــ غور کیجیے کہ اس موقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف سے تین چار الفاظ میں جواب دیا گیا' حالانکہ صحابہ کرامؓ کا یہ معمول نہیں تھا' بلکہ حضور ﷺ کے سوال کے جواب میں صحابہؓ عموماً عرض کیا کرتے تھے: اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ اور اگر کہیں دوبارہ پوچھا جاتا تو بہت مختصر

---

(١٠) صحیح مسلم' کتاب الحج' باب حجة النبی ﷺ۔ وسنن ابی داؤد' کتاب المناسك' باب صفة حجة النبی ﷺ۔

سا جواب دیتے۔ لیکن یہاں صحابہ کرامؓ نے معمول سے ہٹ کر تین چار الفاظ میں جواب دیا۔ یہ سوال و جواب اس لیے کہ آخرت میں جواب دہی ہوگی۔

پھر یہ فریضۂ تبلیغ جناب محمد رسول اللہ ﷺ اپنی اُمت کے حوالے کر گئے اور فرمایا: ((فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ))(۱۱) ''پس اب پہنچائیں وہ جو یہاں موجود ہیں ان تک جو موجود نہیں ہیں۔'' میں سبکدوش ہوا' میری ذمہ داری ختم ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ﴿اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ۝۵﴾ (المزمل) ''ہم عنقریب آپؐ پر ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں'' فرما کر جو بھاری ذمہ داری میرے کاندھے پر ڈالی تھی آج وہ قولِ ثقیل میرے کاندھے سے تمہارے کاندھوں پر منتقل ہو گیا ہے۔ اب پہنچائیں وہ جو یہاں ہیں' اُن کو جو یہاں نہیں ہیں۔ اس سے زیادہ بلیغ الفاظ ممکن نہیں ہیں' اس لیے کہ یہ الفاظ زمان و مکان دونوں کا احاطہ کر رہے ہیں۔ اُس وقت روئے زمین میں موجود ایک ایک انسان اس میں شامل ہے اور تا قیامِ قیامت آنے والی نسلیں بھی اس میں شامل ہیں۔

تذکیر: دوسری اہم اصطلاح ''تذکیر'' ہے — قرآن مجید اپنے آپ کو ''ذکریٰ'' بھی کہتا ہے اور ''تذکیر'' بھی(۱۲) — اس تذکیر کے لیے آلۂ تذکیر قرآن ہے۔ فرمایا: ﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ۝۴۵﴾ (ق) ''(اے نبی ﷺ!) آپ تذکیر کیجیے قرآن کے ذریعے سے اس کو جو میری پکڑ سے ڈرتا ہو۔''

تبشیر: اسی طرح ایک اصطلاح ''تبشیر'' ہے۔ بشریٰ بھی قرآن مجید کی اہم اصطلاحات میں سے ہے اور سورہ البقرۃ اور سورۃ النحل میں قرآن مجید کے لیے بشریٰ کا لفظ آیا ہے۔ سورۃ البقرۃ میں فرمایا: ﴿بُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝۹۷﴾ اور سورۃ النحل میں دو مرتبہ فرمایا: ﴿بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ۝﴾ (آیت ۸۹ اور ۱۰۲) کہ قرآن مسلمانوں اور مؤمنین کے لیے بشارت ہے۔

انذار: تبشیر کے مقابلے میں ایک اور اہم اصطلاح ''انذار'' ہے' اور یہ انذار بھی قرآن کے

---

(۱۱) صحیح البخاری' کتاب الحج' باب الخطبة ایام منیٰ۔ وصحیح مسلم' کتاب القسامة والمحاربین والقصاص والدیات' باب تغلیظ تحریم الدماء والاعراض والاموال۔

(۱۲) ﴿وَلٰكِنْ ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝۶۹﴾ (الانعام) ﴿فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝۲﴾ (الاعراف) ﴿وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۲۰﴾ (هود)

ذریعے سے ہوگا: ﴿وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ؕ﴾ (الانعام:۱۹) ''اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ میں تمہیں بھی اس کے ذریعے خبردار کردوں اور ان کو بھی جن تک یہ قرآن پہنچے''۔ اس حوالے سے سورۃ الشوریٰ کی وہ آیت ذہن میں لائیے: ﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنْذِرَ یَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَیْبَ فِیْهِ ؕ﴾ (آیت ۷) ''اور اسی طرح ہم نے وحی کیا ہے آپ کی طرف یہ قرآنِ عربی تاکہ آپ خبردار کردیں بستیوں کے مرکز اور اس کے اردگرد رہنے والوں کو اور آپ خبردار کردیں اُس جمع ہونے والے دن سے جس میں کوئی شک نہیں۔''

تبشیر اور انذار کا ذریعہ بھی قرآن ہے اور یہ دونوں چیزیں بڑی خوبصورتی سے سورۂ مریم کے اختتام پر جمع ہوگئی ہیں: ﴿فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِیْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ﴿۹۷﴾﴾ ''تو ہم نے آسان کردیا ہے اس (قرآن) کو آپؐ کی زبان میں تاکہ آپؐ بشارت دیں اس کے ساتھ متقین کو اور خبردار کریں اس کے ساتھ جھگڑالو قوم کو''۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ اس آیت کی تلاوت کرتے ہوئے میں ''بِهٖ'' پر زور دیا کرتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں بِهٖ فرما کر اس بات کو نمایاں کیا گیا ہے کہ تبشیر وانذار کا حقیقی اور اصل ذریعہ قرآن مجید ہی ہے۔ اسی طرح سورۃ الکہف کے آغاز میں بھی بڑے مہتم بالشان اسلوب سے اس کا ذکر فرمایا گیا:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ؕ﴿۱﴾ قَیِّمًا لِّیُنْذِرَ بَاْسًا شَدِیْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَیُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ﴿۲﴾﴾

''کُل حمد وثنا اور کُل شکر اللہ ہی کے لیے ہے جس نے نازل کی اپنے بندے پر کتاب اور اس میں اُس نے کوئی کجی نہیں رکھی۔ (یہ کتاب) بالکل سیدھی ہے' تاکہ وہ خبردار کرے ایک بہت بڑی آفت سے اُس کی طرف سے اور (تاکہ) وہ بشارت دے اُن اہل ایمان کو جو نیک عمل کرتے ہوں کہ ان کے لیے ہوگا بہت اچھا بدلہ۔''

قرآن کی دعوت وتبلیغ کی راہ میں رکاوٹیں

قرآن مجید کی نشر واشاعت اور دعوت وتبلیغ کی راہ میں سب سے زیادہ رکاوٹ ڈالنے والے باطل نظریات' مشرکانہ اوہام اور مبتدعانہ افعال ہوتے ہیں۔ ہم نے قرآن کی تبلیغ کو تو پس پشت ڈال رکھا ہے اور تبلیغ کے نام سے کہیں فرقہ واریت اور فقہی مسلک پر دھواں دھار

تقریریں ہیں' کہیں محض فضائل کے بیان کو تبلیغ کا نام دے دیا گیا ہے۔ مزید یہ کہ اس کے لیے بھی ذریعہ قرآن نہیں ہے' بلکہ ضعیف وشاذ اور مرسل احادیث کا سہارا ہے یا بزرگانِ دین کی کرامات کا بیان اس کی بنیاد ہے۔ اسی کا تو علامہ اقبال نے مرثیہ کہا ہے اور کیسے کیسے انداز سے کہا ہے۔ وعظ ہے تو قرآن سے نہیں' تزکیہ ہے تو قرآن سے نہیں' تذکیر ہے تو قرآن سے نہیں' تبلیغ ہے تو قرآن کی نہیں۔ عوام ہوں کہ خواص' کسی کو قرآن سے نہ اعتنا ہے' نہ دلچسپی — اِلّا ماشاءاللہ۔ اُمتِ مسلمہ کے مختلف طبقات کا علامہ نے کس قدر صحیح نقشہ کھینچا ہے:

صوفیٔ پشمینہ پوشِ حال مست
از شرابِ نغمۂ قوال مست
آتش از شعرِ عراقی در دلش
در نمی سازد بقرآں محفلش
واعظ دستاں زن و افسانہ بند
معنیٔ او پست و حرفِ اُو بلند
از خطیب و دیلمی گفتارِ او
با ضعیف و شاذ و مرسل کارِ اُو(۱۳)

پھر علامہ نے فقیہانِ حرم کی اکثریت کی نقشہ کشی یوں کی ہے: ؎

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق!

لہٰذا عوام کا تو کہنا ہی کیا' وہ تو ہیں ہی کشتہ ملائی و سلطانی و پیری' ان فقیہان کی عظیم

---

(۱۳) اونی لباس میں ملبوس اور اپنے حال میں مست صوفی' قوال کے نغمے کی شراب ہی سے مدہوش ہے! اس کے دل میں عراقی کے کسی شعر سے تو آگ لگ جاتی ہے لیکن اس کی محفل میں قرآن کا کہیں گزر نہیں۔

(دوسری طرف) واعظ کا حال یہ ہے کہ ہاتھ بھی خوب چلاتا ہے اور سماں بھی خوب باندھ دیتا ہے اور اس کے الفاظ بھی پُرشکوہ اور بلند و بالا ہیں لیکن معنی کے اعتبار سے نہایت پست اور ہلکے! اس کی ساری گفتگو (بجائے قرآن کے) یا تو خطیب بغدادی سے ماخوذ ہوتی ہے یا دیلمی سے' اور اس کا سارا سروکار بس ضعیف' شاذ اور مرسل حدیثوں سے رہ گیا ہے۔

اکثریت قرآن کے معاملہ میں بے ذوق بھی ہے اور بے طلب بھی۔ بقول علامہ مرحوم ؎

صاحبِ قرآن و بے ذوقِ طلب
العجب، ثم العجب، ثم العجب!

انقلابِ محمدی کی اساس و بنیاد

بہرحال میں نے اب تک جو کچھ عرض کیا ہے، اس سے یہ بات آپ پر واضح ہوگئی ہوگی کہ از روئے قرآن، تبشیر قرآن سے، انذار قرآن سے، نصیحت و موعظت قرآن سے، تزکیہ قرآن سے اور تبلیغ قرآن کی۔ یہ ہیں بنیادی اصطلاحات۔ قرآن مجید میں انقلابِ محمدی ﷺ کا اساسی اور بنیادی لائحہ عمل چار مرتبہ بیان کیا گیا ہے، اور اس کے چار عناصر ترکیبی ذکر کیے گئے ہیں، جن میں پہلا عنصر تلاوتِ آیات ہے۔ سورۃ البقرۃ میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کی دُعا میں یہ الفاظ آئے: ﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ.....﴾ (آیت ۱۲۹)۔ سورۃ البقرۃ ہی میں نبی اکرم ﷺ کی بعثت کی طرف اشارے میں بھی یہی الفاظ آئے: ﴿كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنْكُمْ يَتْلُوا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا.....﴾ (آیت ۱۵۱)۔ اس کے بعد سورۂ آل عمران میں پھر اعادہ ہو رہا ہے: ﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ.....﴾ (آیت ۱۶۴) اور پھر آخری بار سورۃ الجمعہ میں فرمایا جا رہا ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ.....﴾ (آیت ۲)۔ یہ تلاوتِ آیات ہے بغرضِ دعوت، بغرضِ تبلیغ، بغرضِ تبشیر، بغرضِ انذار اور بغرضِ تذکیر۔

یہ ہے درحقیقت انقلابِ محمدی ﷺ کا پہلا قدم۔ اگر یہ نہیں ہے، اور اس طور سے نہیں ہے، اور اس ذریعے سے نہیں ہے تو جان لیجیے کہ انقلابِ محمدیؐ یا انقلابِ اسلامی کی طرف پیش قدمی نہیں ہو رہی۔ مستعار نظریات ہوں یا انسان کے اپنے بنائے ہوئے خیالات ہوں یا کسی شخصیت کا علمی رعب اور دبدبہ لوگوں کو کھینچ کر جمع کر رہا ہو تو اسے قرآن کی انقلابی دعوت و تحریک ہرگز نہیں کہا جائے گا۔ بالفاظِ دیگر کسی تحریک اور دعوت کے عمل کا جب تک مرکز و محور اور مبنیٰ و مدار قرآن کو نہیں بنایا جائے گا، انقلابِ محمدی ﷺ کی طرف پیش قدمی نہیں ہوگی۔

میں چند روز قبل سورۃ الفرقان کا مطالعہ کرتے ہوئے چونک گیا۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ قرآن حکیم کی آیات میں آنے والے لفظ ''بِہٖ'' کا ہمارے اکثر مفسّرین کما حقہٗ حق ادا نہیں کر

سکے۔ سورۃ الفرقان میں فرمایا: ﴿فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ۝۵۲﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) آپ ان کفار کا کہنا نہ مانیے' اور آپؐ ان کے ساتھ جہاد کریں اس (قرآن) کے ذریعے سے بڑا جہاد''۔ یہ قرآن آپؐ کا پہلا آلۂ جہاد ہے' یہ وہ پہلی شمشیر ہے جو ذہنوں کو تسخیر کرے گی۔ نظریات کو' افکار کو' عقائد کو' خیالات کو اور تصورات کو اسلام کے رُخ پر لانے والی چیز یہی قرآن مجید ہے۔ بقول مولانا حالی مرحوم ؎

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اِک نسخہ کیمیا ساتھ لایا

علامہ اقبال مرحوم نے اسی بات کو یوں بیان کیا ؎

در شبستانِ حرا خلوت گزید
قوم و آئین و حکومت آفرید

قرآن سے ساری دعوت و تبلیغ' اسی سے تبشیر و انذار اور اسی سے موعظت و نصیحت' یہ سارا عمل ﴿جَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ۝﴾ ہے۔ یاد رکھیے کہ تصادم سب سے پہلے نظریاتی سطح پر ہوتا ہے اور کشمکش جب بھی ہوگی اس کا پہلا ہدف نظریات' افکار اور عقائد ہوں گے۔

اس ضمن میں' میں علامہ اقبال کے چند اشعار پیش کر کے آگے چلوں گا۔ میں نے جو بات قدرے تفصیل سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے' علامہ مرحوم نے اس کو ان اشعار میں نہایت بلاغت و فصاحت اور جامعیت سے ادا کیا ہے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں:

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

''اگر تو فی الواقع مسلمان کی زندگی گزارنا چاہتا ہے تو یہ اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ تو قرآن کے مطابق زندگی بسر کرے۔''

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم
حکمتِ او لایزال است و قدیم

''وہ زندہ کتاب' قرآن حکیم' جس کی حکمت لازوال بھی ہے اور قدیم بھی!''

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است!

مثلِ حق پنہاں و ہم پیدا ست ایں
زندہ و پائندہ و گویا ست ایں
صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست
عصر ہا پیچیدہ در آناتِ اوست!

''(اس کتاب کے بارے میں) جو بات میرے دل میں پوشیدہ ہے اسے اعلانیہ ہی کہہ گزروں؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب نہیں کچھ اور ہی شے ہے۔ یہ ذات حق سبحانہ وتعالیٰ (کا کلام ہے لہٰذا اسی) کے مانند پوشیدہ بھی ہے اور ظاہر بھی۔ اور جیتی جاگتی بولتی بھی ہے اور ہمیشہ قائم رہنے والی بھی! اس کی آیتوں میں سینکڑوں تازہ جہان آباد ہیں اور اس کے ایک ایک لمحے میں بے شمار زمانے موجود ہیں!''

اور کس خوبصورتی سے مسلمانوں کو قرآن کے ذریعے ایک عالمگیر انقلاب برپا کرنے کی دعوت دیتے ہیں:

بندۂ مؤمن ز آیاتِ خداست
ہر جہاں اندر برِ اُو چوں قباست
چوں کہن گردد جہانے در برش
می دہد قرآں جہانے دیگرش
یک جہانے عصرِ حاضر را بس است!
گیر اگر در سینہ دل معنی رس است!

''بندۂ مؤمن آیاتِ خداوندی میں سے ہے اور اس عالم کی حیثیت بس ایسی ہے جیسی اس کے لباس میں ایک قبا۔ جب اس کے لباس کی کوئی قبا یعنی کوئی عالَم پرانا ہو جاتا ہے تو قرآن اسے ایک جہانِ نو عطا فرما دیتا ہے۔ عصرِ حاضر کو بھی بس ایک ایسا ہی جہانِ نو درکار ہے (جو قرآن سے ماخوذ اور مستنبط ہو!) اے مسلمان اگر تیرے سینے میں ایک ایسا دل ہے جو معانی کی گہرائیوں تک رسائی حاصل کر سکتا ہو تو (مجھ سے) یہ راز کی بات حاصل کر لے!''

تربیت اور تزکیۂ نفس کا ذریعہ: قرآنِ عظیم

میں نے عرض کیا تھا کہ اس انقلاب کے عمل میں تیسری چیز 'تربیت' ہے اور وہ انقلابی فکر کی مناسبت سے ہوگی۔ اس کے لیے قرآن کی اصطلاح ہے 'تزکیہ' اور پھر اسی تزکیہ کے ساتھ

وہ ملحق کرتا ہے تعلیم کو—— میں نے تلاوتِ آیات کے لیے چار آیات کے ابتدائی حصوں کا حوالہ پیش کیا تھا۔ اب ان چاروں آیات کو سامنے رکھیے تاکہ آگے کی بات کی تفہیم میں آسانی ہو۔ سورۃ البقرۃ میں دعائے ابراہیمی و اسماعیلی علیہما الصلوٰۃ والسلام مذکور ہے:

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ﴾ (آیت ۱۲۹)

''اے ہمارے رب! تو مبعوث فرمائیو ان ہی میں سے ایک رسول جو ان کو سنائے تیری آیات اور انہیں تعلیم دے کتاب اور حکمت کی اور تزکیہ کرے ان (کے قلوب و اذہان) کا۔''

خلیل اللہ اور ذبیح اللہ علیہما السلام کی دُعا میں ''تزکیہ'' کا ذکر بعد میں تھا' لیکن اسی سورہ کی آیت ۱۵۱ میں جب اس دعا کی قبولیت کا اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا تو اپنے علم کامل کی بنیاد پر ترتیب کو بدل دیا:

﴿كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾﴾

''چنانچہ بھیج دیا ہم نے ایک رسول تم ہی میں سے جو سناتا ہے تمہیں ہماری آیات اور تزکیہ کرتا ہے تمہارا اور تعلیم دیتا ہے تمہیں کتاب اور حکمت کی اور تمہیں تعلیم دیتا ہے ان چیزوں کی جنہیں تم نہیں جانتے تھے۔''

سورۂ آل عمران میں یہ مضمون بڑی آن بان کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے احسان کے طور پر بیان فرمایا:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۶۴﴾﴾

''بے شک اللہ نے احسان فرمایا ہے اہلِ ایمان پر کہ اٹھایا ان ہی میں سے ایک رسول' ان ہی میں کا' جو سناتا ہے انہیں اس کی آیات اور تزکیہ کرتا ہے ان کا اور تعلیم دیتا ہے انہیں کتاب اور حکمت کی' اگرچہ وہ تھے اس سے قبل کھلی گمراہی میں!''

آخری بار یہ مضمون سورۃ الجمعہ میں اس طور پر آیا ہے کہ اس میں نبی اکرم ﷺ کے انقلاب کے اساسی و بنیادی منہاج کے عناصر چہارگانہ کی طرف رہنمائی بڑے واضح انداز میں کر دی گئی۔ فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۙ﴾

''وہی ہے (اللہ) جس نے اٹھایا اُمیوں میں ایک رسول ان ہی میں سے' جو سناتا ہے انہیں اس کی آیات اور تزکیہ کرتا ہے ان کا اور تعلیم دیتا ہے ان کو کتاب اور حکمت کی' اگرچہ وہ تھے اس سے قبل کھلی گمراہی میں۔''

یہاں اس کی اہمیت اس اعتبار سے بہت بڑھ جاتی ہے کہ سورۃ الجمعہ سے متصلاً قبل سورۃ الصّف ہے جس کی مرکزی آیت میں نبی اکرم ﷺ کے مقصدِ بعثت کے انقلابی پہلو کو واضح کیا گیا ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾

(آیت ۹)

''وہی ہے جس نے بھیجا ہے اپنے رسول کو الہدیٰ اور دین حق دے کر تاکہ وہ غالب کر دے اسے کُل کے کُل نظامِ زندگی پر۔''

میں عرض کر رہا تھا کہ انقلابِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا تیسرا مرحلہ 'تربیت' ہے جس کے لیے قرآنِ مجید کی اپنی اصطلاح ہے ''تزکیہ'' اور اس کے ساتھ ملحق ہے ''تعلیم''۔ لہٰذا جان لیجیے کہ اس تزکیہ اور تعلیم کا مرکز و محور اور مبنیٰ و مدار بھی یہی قرآنِ مجید ہے۔ اور میں نہایت دکھ اور رنج کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ اس معاملہ میں قرآن کی ناقدری کا معاملہ ہم نے تقریباً آخری حدوں تک پہنچا دیا ہے۔ ہم نے یہ سمجھا ہے کہ اس اعتبار سے (معاذ اللہ!) قرآن مجید درخورِ اعتناء ہے ہی نہیں' تزکیۂ نفس کے لیے تو ہمیں کہیں نہ کہیں سے بھیک مانگنی پڑے گی۔ اس کے لیے طریقے ہمیں دوسروں سے مستعار لینے پڑیں گے' چاہے وہ نو افلاطونی نظریات ہوں' چاہے وہ ہندو جوگیوں کی تپسیائیں اور ان کی ریاضتیں ہوں' چاہے وہ عیسائی راہبوں کی طرح رہبانیت اختیار کر کے خانقاہوں میں ریاضتیں اور عبادتیں ہوں۔ حالانکہ قرآن مجید دو مقامات پر یہ کہتا ہے کہ باطنی امراض کے لیے قرآن میں شفا ہے۔

روحانی و باطنی امراض اور ان کا علاج

باطنی امراض میں تکبّر سب سے بڑا روگ ہے' حُبِّ مال اور حُبِّ جاہ بہت بڑے بڑے روگ ہیں' اور ان سب روگوں کو جمع کریں تو وہ اصطلاح بنے گی: حُبِّ دُنیا۔ جیسے سورۃ الاعلیٰ میں فرمایا:

﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿١٦﴾ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴿١٧﴾﴾

''بلکہ تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔ جبکہ آخرت بہتر بھی ہے اور باقی رہنے والی بھی۔''

اور سورۃ القیامہ میں فرمایا:

﴿كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ﴿٢٠﴾ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿٢١﴾﴾

''ہرگز نہیں! اصل بات یہ ہے کہ تم لوگ جلدی ملنے والی چیز (یعنی دنیا) سے محبت کرتے ہو۔ اور تم آخرت کو چھوڑ دیتے ہو۔''

جب تک ان باطنی امراض سے سینہ پاک نہیں ہوگا اس وقت تک وہ تربیت حاصل نہیں ہوگی جو انقلابِ محمدی ﷺ کے لیے ضروری ہے۔ اس کے لیے ذریعہ کیا ہے؟ اس کی طرف رہنمائی کی جارہی ہے سورۂ یونس کی آیت ۵۷ میں۔ فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ﴾

''لوگو! تمہارے پاس آ گئی ہے تمہارے رب کی جانب سے موعظت و نصیحت بھی اور جملہ امراضِ قلبی کی شفا بھی۔''

دوسری جگہ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۸۲ میں فرمایا:

﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴾

''اور ہم قرآن سے جو اتارتے ہیں وہ شفا اور رحمت ہے ایمان والوں کے لیے۔''

یہ دونوں آیات میرے نزدیک اس امر پر برہانِ قاطع ہیں کہ تزکیۂ نفوس' تصفیۂ قلوب اور تجلیۂ باطن درحقیقت ثمرہ ہوتا ہے تلاوت اور تدبر قرآن حکیم کا' لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ اس حوالے سے ہم نے قرآن کو پس پشت ڈالا ہوا ہے۔

جہاد کے مراحل و مدارج کا جائزہ لیں تو جہاد کی پہلی سطح جہاد مع النفس ہے۔ اس کی عملی تدبیر کے لیے آپ قرآن سے رہنمائی چاہیں گے تو وہ ملے گی قیام اللیل اور تہجد کے عنوان سے' اور ان دونوں کا تعلق قرآن حکیم سے ہے۔ سورۃ المزمل کی ان آیات میں قیام اللیل کے حکم کے ساتھ ہی وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا کا تاکیدی حکم ہے۔ فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ﴿١﴾ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿٢﴾ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ﴿٣﴾ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ﴿٤﴾﴾

''اے چادر میں لپٹنے والے! رات میں قیام کرو سوائے اس کے تھوڑے سے حصے

کے۔(یعنی) آدھی رات یا اس میں سے کچھ کم کر دو یا اس پر کچھ زیادہ کر لو اور قرآن کی تلاوت کرو ٹھہر ٹھہر کر۔''

جبکہ سورۂ بنی اسرائیل کی آیات ۷۸ اور ۷۹ میں فرمایا:

﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ﴿۷۸﴾ وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ﴾

''نماز کا اہتمام رکھو زوالِ آفتاب کے اوقات سے لے کر شب کے تاریک ہونے تک اور خاص کر فجر کی قراءت کا' بے شک فجر کی قراءت بڑی ہی حضوری کی چیز ہے۔ اور شب میں بھی تہجد پڑھو' یہ اضافی چیز ہے تمہارے لیے۔''

اس آیت کے الفاظ فَتَهَجَّدْ بِهٖ انتہائی قابلِ غور ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن کے تذکرے کے ضمن میں جہاں بھی بِهٖ آیا ہے' ہمارے متقدمین و متاخرین مفسّرین نے اس مقام پر اس کا کما حقہ حق ادا نہیں کیا ہے۔ یہاں یہ بِهٖ اصل کانٹے کی بات ہے۔ تہجد کا اصل مقصد یہ بیان ہو رہا ہے کہ قیام میں قرآن کی طویل قراءت کی جائے' لیکن ہمارا حال' اِلا ماشاء اللہ' اس کے بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ تہجد میں چھوٹی چھوٹی سورتیں پڑھیں اور آٹھ رکعتیں پوری کر لیں۔ قرآن کی طویل قراءت سے کوئی سروکار ہی نہیں۔ پھر بیٹھ گئے اور ضربیں لگائیں' کچھ ذکر کیا' وظائف کا ورد ہوا اور اس میں سب سے زیادہ وقت لگایا۔ یہ ہے وہ طریقہ جو اکثر تہجد گزاروں میں نظر آتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جب اپنے مقام سے اصل شے ہٹے گی تو اس کی جگہ پر کرنے کے لیے کوئی نئی چیز آئے گی۔ لیکن اس طریقے سے نقصان یہ ہوا کہ نہ قیام اللیل کا اصل مقصد سامنے رہا اور نہ تہجد کا اصل نصاب پیش نظر رہا!

قرآن کی ناقدری پر علامہ اقبال کا مرثیہ

مسلمانوں کی قرآن سے بے اعتنائی اور ناقدری پر علامہ اقبال نے انتہائی مؤثر اور تعمیری مرثیے کہے ہیں۔ میں ان کا ایسے ہی معترف نہیں ہوں' اللہ ہم سب کو شخصیت پرستی سے محفوظ رکھے' کردار و عمل کے لحاظ سے علامہ کس مقام پر کھڑے تھے اس سے قطع نظر میں نے کبھی اس بات کے اظہار میں باک نہیں رکھا ہے کہ میرے نزدیک اس دور کے ترجمان القرآن علامہ اقبال ہیں۔ وہ بات جو کبھی امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے لیے کہی گئی اور وہ بات جو کبھی مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کے لیے کہی گئی کہ ع ''ہست قرآں در زبانِ پہلوی!'' اس دور میں وہ مقام علامہ

اقبال کا ہے' چاہے کسی کو پسند ہو یا ناپسند ہو۔ چنانچہ ذرا دیکھئے کہ کس کس انداز سے علامہ نے مسلمانوں کی قرآن سے بے اعتنائی اور بے نیازی کا مرثیہ کہا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست
کہ از یاسینِ اُو آساں بمیری!

''(لیکن افسوس کہ اے مسلمان!) تجھے اس کی آیات سے اب اس کے سوا اور کوئی سروکار نہیں رہا کہ اس کی سورۂ یٰسین کے ذریعے موت کو آسان کر لے!''

مزید یہ کہ ہمارے اہلِ علم وتصوف کی' الّا ماشاء اللہ' قرآن کی جانب عدم توجہی کی روش سے علامہ کو کس قدر دکھ تھا' اس کا ذکر ان کے کلام میں جا بجا موجود ہے جس میں ان کا دلِ حساس خون کے آنسو روتا نظر آتا ہے۔ کتنی تلخی ہے علامہ کے ان اشعار میں جو میں آپ کو پہلے بھی سنا چکا ہوں اور ابھی پھر انہی کا اعادہ کر رہا ہوں ؎

صوفی پشمینہ پوشِ حالِ مست
از شرابِ نغمۂ قوال مست
آتش از شعر عراقی در دلش
در نمی سازد بقرآں محفلش
واعظ دستاں زن و افسانہ بند
معنیٔ اُو پست و حرفِ اُو بلند
از خطیب و دیلمی گفتارِ اُو
باضعیف و شاذ و مرسل کارِ اُو

''ادنیٰ لباس میں ملبوس اور اپنے حال میں مست صوفی قوال کے نغمے کی شراب ہی سے مدہوش ہے! اس کے دل میں عراقی کے کسی شعر سے تو آگ سی لگ جاتی ہے لیکن اس کی محفل میں قرآن کا کہیں گزر نہیں! (دوسری طرف) واعظ کا حال یہ ہے کہ ہاتھ بھی خوب چلاتا ہے اور سماں بھی خوب باندھ دیتا ہے اور اس کے الفاظ بھی پرشکوہ اور بلند و بالا ہیں لیکن معنی کے اعتبار سے نہایت پست اور ہلکے!''

واقعہ یہ ہے کہ اس دور میں ہمارے اہلِ تصوّف کی' اِلّا ماشاء اللہ' یہی کیفیت ہے کہ قوالیوں سے حال آئے گا' عراقی اور جامی کے اشعار سنیں گے تو تڑپ اُٹھیں گے' لیکن قرآن مجید کا ان کی محفلوں میں گزر نہیں ہوگا' اس سے ان کو کوئی سروکار ہی نہیں ہوگا۔ قرآن کی

تلاوت یا قراءت سے ان کے دلوں میں گداز پیدا نہیں ہوگا۔ حالانکہ دلوں کے امراض اور شیطان کے وسوسوں اور ترغیبات کو ختم کرنے کے لیے اصل شمشیر دراصل قرآن ہی ہے۔ کیا پیاری بات کہی ہے علامہ نے ؎

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است
زانکہ او گم اندر اعماقِ دل است!

اس شعر میں علامہ نے اس حدیث کی ترجمانی کی ہے: ((اِنَّ الشَّیْطَانَ یَجْرِیْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَی الدَّمِ)) (۱۴) کہ شیطان کو کہاں مارو گے' کیسے اُسے قتل کرو گے' شیطان تو انسان کے وجود میں خون کی طرح سرایت کیے ہوئے ہے۔ اگلے شعر میں علامہ شیطان کو قتل کرنے کی وہ تدبیر بتاتے ہیں جو انہوں نے اختیار کی:

خوشتر آں باشد مسلمانش کنی
کشتۂ شمشیر قرآنش کنی

''اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اپنے شیطان کو مسلمان کرلو اور اسے قرآن کی شمشیر سے گھائل کرو۔''

تمام امراض کا علاج قرآن مجید ہے!

تزکیہ کا اصل ذریعہ اور امراضِ قلبیہ وصدریہ کے لیے اصل تلوار قرآن مجید ہے' جملہ امراضِ ذہنی و روحانی کے لیے بھی اصل تلوار قرآن کی آیاتِ بینات ہیں اور نفس کے تمام روگوں کے لیے بھی اصل مداوا' اصل شفا اور اصل علاج قرآن مجید ہی ہے۔ امام بیہقیؒ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِنَّ هٰذِهِ الْقُلُوْبَ تَصْدَأُ كَمَا يَصْدَأُ الْحَدِيْدُ اِذَا اَصَابَهُ الْمَاءُ)) قِيْلَ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا جِلَاءُ هَا؟ قَالَ: ((كَثْرَةُ ذِكْرِ الْمَوْتِ وَتِلَاوَةُ الْقُرْآنِ)) (۱۵)

''ان دلوں کو بھی زنگ لگ جاتا ہے جیسے لوہا پانی پڑنے سے زنگ آلود ہو جاتا ہے''۔ دریافت کیا گیا: یارسول اللہ! اس زنگ کو دور کس چیز سے کیا جائے؟ فرمایا: ''موت کی

---

(۱۴) صحیح البخاری' کتاب بدء الخلق' باب صفة ابلیس وجنوده۔ وصحیح مسلم' کتاب السلام' باب بیان انه یستحب لمن رئی خالیا بامرأة.....

(۱۵) رواه البیهقی فی شعب الایمان۔ مشکوٰة المصابیح' کتاب فضائل القرآن' الفصل الثالث۔

بکثرت یاد اور قرآن مجید کی تلاوت!''

انسان کے قلب کے زنگ آلود ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس میں کبر و عجب ڈیرہ ڈال لے' اس میں حبِ دنیا براجمان ہو جائے' اس میں حسد اپنے پنجے گاڑ لے' نیز قلب اسی نوع کے مفاسد کی آماجگاہ بن جائے تو ان تمام روگوں سے دل کو صیقل کرنے کے دو ذرائع ہیں: ایک موت کی بکثرت یاد اور دوسرا تلاوتِ قرآن۔ گویا اس حدیث سے بھی واضح طور پر مترشح ہوتا ہے کہ تزکیہ نفس کا منصوص و ماثور طریقہ تلاوتِ قرآن مجید ہی ہے۔

اب تک انقلاب کے دو مراحل پر بات ہوئی ہے' ایک ہے انقلابی نظریہ اور فکر اور دوسرا ہے اس کے مطابق تربیت و تزکیہ۔ ان کے حوالے سے جان لیجیے کہ یہ دونوں مرحلے ہر انقلاب کے لیے pre-requisites ہیں کہ ان کے بغیر کسی انقلابی جدوجہد کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اسلامی انقلاب کا مقصود ہے: لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔ جس کو اقبال نے کہا۔

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتہ شرعِ مبیں این است و بس!

''شریعت حقہ اور نظامِ اسلامی کا اصل مقصود یہی ہے کہ دنیا میں کوئی کسی کا محتاج نہ رہے۔''

دراصل اسلام ہی وہ دین (نظامِ زندگی) ہے جس میں تمیز بندہ و آقا موجود نہیں ہے۔ اس کے لیے جو انقلابی جدوجہد درکار ہے اس کے پہلے دو مراحل یعنی انقلابی فکر و نظریہ اور تربیت و تزکیہ کے لیے مبنیٰ و مدار اور مرکز و محور (axis)' اس کا ذریعہ اور اس کا وسیلہ صرف اور صرف قرآنِ مجید ہے۔ اگر اس بات کو حرزِ جاں نہ بنایا گیا تو پھر معاملہ الٹ ہو جائے گا اور اسلام کی راہ ہموار ہونے کے بجائے کسی اور کا کام ہو جائے گا۔ کوئی وقتی سا نعرہ ہو اور اقبال کے اس مصرع کے مصداق کہ ع ''سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری ایک ہو!'' کہیں سے کوئی 'ہو' پھر آئے اور لوگ پھر اُٹھ کھڑے ہوں تو اس سے وہ کام نہیں بنے گا جو مطلوب اور پیش نظر ہے' یعنی اسلامی انقلاب کے تقاضے پورے نہیں ہوں گے۔ قرآن کے انقلابی فکر کے اعتبار سے تبلیغ و دعوت اور اسی فکر کے تقاضوں کے اعتبار سے تزکیہ و تربیت درکار ہیں۔ بقول علامہ اقبال:

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد' جہاں دیگر شود!

''(یہ کتاب حکیم) جب کسی کے باطن میں سرایت کر جاتی ہے تو اس کے اندر ایک انقلاب برپا ہو جاتا ہے اور جب کسی کے اندر کی دنیا بدل جاتی ہے تو اس کے لیے پوری دنیا ہی انقلاب کی زد میں آ جاتی ہے!''

یہی طریقۂ محمدی ﷺ ہے۔ ''چوں بجاں در رفت'' کے مصداق قرآنِ حکیم' صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے باطن میں سرایت کر گیا اور ان کے اذہان وقلوب اس کے نور سے منور ہو گئے تو انؓ کی زندگیوں میں ایک انقلابِ عظیم برپا ہو گیا۔ ان کی سوچ بدل گئی' ان کا فکر بدل گیا' ان کے عقائد بدل گئے' ان کی اَقدار بدل گئیں' ان کے عزائم بدل گئے' ان کے مقاصد بدل گئے' ان کی آرزوئیں بدل گئیں' ان کی تمنائیں بدل گئیں' ان کے دن بدل گئے' ان کی راتیں بدل گئیں' ان کی صبحیں بدل گئیں' ان کی شامیں بدل گئیں' ان کی زمین بدل گئی' ان کا آسمان بدل گیا۔ یہاں تک کہ اگر پہلے زندگی عزیز تھی تو اب موت عزیز تر ہو گئی اور کیفیت یہ ہو گئی کہ:

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی!

اور جن کے قبیلوں کا پیشہ لوٹ مار تھا اور جو اَن پڑھ اور امی تھے' ان کا حال یہ ہو گیا کہ ؎

رہزناں از حفظ اُو رہبر شدند
از کتابے صاحبِ دفتر شدند

''اسے یاد کر لینے کے باعث یا اس کی حفاظت میں آ کر رہزن اور لٹیرے رہبر و رہنما بن گئے اور اس ایک کتاب کے طفیل وہ خود بہت سی کتابوں کے مصنف بن گئے!''

حاصل کلام یہ ہے کہ آپ اسے اسلامی انقلاب کہہ لیں' اسلام کی نشاۃ ثانیہ کہہ لیں' اسلامی نظامِ حیات کا قیام و نفاذ کہہ لیں' اصلاحِ معاشرہ کہہ لیں' یہ تمام اصطلاحات دراصل ایک ہی حقیقت کی تعبیر کے مختلف اسالیب ہیں۔ یہ سب کچھ اس وقت تک روبہ عمل آنا ممکن نہیں ہے جب تک ہم ان کے لیے قرآن مجید کو اپنا رہنما اور ہادی نہ بنائیں اور قرآن ہمارے اذہان وقلوب میں نفوذ نہ کرے۔ آج ہم جس المیہ سے دوچار ہیں وہ دراصل یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس کتابِ ہدایت سے ہمارا تعلق نہ صرف یہ کہ مضمحل اور کمزور ہو گیا ہے بلکہ اگر آپ حضرات برا نہ مانیں تو میں عرض کروں کہ تقریباً معدوم کے درجے میں آ گیا ہے۔ ہمارے حال پر کیسی صادق آتی ہے یہ حدیث مبارکہ جس کو امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ

سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتٰبِ اَقْوَامًا وَيَضَعُ بِهٖ آخَرِيْنَ))(۱۶) ''اللہ تعالیٰ اس قرآن مجید کے ذریعے بہت سی قوموں کو عزت و سربلندی سے سرفراز فرمائے گا اور دوسروں کو (اس کتاب ہدایت کو ترک کرنے کے باعث) ذلت و نکبت سے دوچار فرمائے گا''۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم' تابعین و تبع تابعین رحمہم اللہ نیز ان کے بعد آنے والوں نے جب تک اس کتاب کو اپنا لائحہ عمل اور رہنما بنائے رکھا تو ﴿وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ﴾ کا وعدۂ الٰہی پورا ہوتا رہا اور جب ہم نے اس قرآن کو محض ایک کتابِ مقدس سمجھ کر اس کے ساتھ محض ظاہری احترام کا معاملہ اختیار کیا اور اس کی تعلیمات سے سراسر روگردانی اور اعراض کیا تو اس کی پاداش میں وہی کچھ ہوا اور ہو رہا ہے جس کی خبر دی تھی الصادق المصدوق ﷺ نے کہ وَيَضَعُ بِهٖ آخرين۔ اس مضمون کو بھی علامہ نے اس شعر میں بڑی خوبصورتی سے ادا کیا ہے ؎

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر!

محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر تکمیلِ نبوت کا تقاضا

اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے کہ نبی اکرم ﷺ پر نبوت ختم ہی نہیں بلکہ کامل بھی ہوئی ہے۔ آنحضور ﷺ کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد جو چیز محمدؐ رسول ﷺ کی جانشین اور قائم مقام ہے وہ ہے قرآنِ مجید' فرقانِ حمید' کتابِ مبین' جو دائم و قائم ہے اور تا قیامِ قیامت ایک شوشے کے تغیر کے بغیر اور ہر تحریف لفظی سے محفوظ زندہ و پائندہ رہے گی۔ چنانچہ حجۃ الوداع میں آنحضور ﷺ نے جو آخری بات فرمائی وہ اسی قرآن مجید کے متعلق ہے۔ صحیح مسلم میں حجۃ الوداع کے اختتامی اور آخری الفاظ یہ ہیں:

((وَقَدْ تَرَكْتُ فِيْكُمْ مَالَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَهٗ اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهٖ : كِتَابُ اللّٰهِ))(۱۷)

''اور میں تمہارے درمیان وہ چیز چھوڑے جا رہا ہوں جس کو اگر تم مضبوطی سے تھامے رکھو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے' اور وہ چیز ہے: کتاب اللہ!''

معلوم ہوا کہ ہماری ہدایت کی ضمانت اعتصام بالقرآن ہے اور اس کو چھوڑنے کا لازمی نتیجہ ضلالت و گمراہی ہے جس کی سزا ہم بھگت رہے ہیں۔ قرآن ہی دراصل ہمارا انقلابی فکر اور

(۱۶) صحیح مسلم' کتاب صلاۃ المسافرین وقصرھا' باب فضل من یقوم بالقرآن.....

(۱۷) صحیح مسلم' کتاب الحج' باب حجۃ النبی ﷺ۔

نظریہ ہے۔ اس انقلابی فکر کی تبلیغ کو نبی اکرم ﷺ نے اتنی وسعت دی کہ فرمایا: ((بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَۃً)) ''پہنچاؤ میری طرف سے چاہے ایک ہی آیت کیوں نہ ہو''۔ گویا ہر مسلمان پر لازم ہے' فرض ہے کہ وہ قرآن کا مبلغ بنے' چاہے ایک ہی آیت کو اچھی طرح سمجھ کر دوسروں تک پہنچائے۔ یہ تبلیغ گویا نبی اکرم ﷺ کی جانب سے ہوگی۔ یہاں 'عَنِّیْ' کا صحیح مفہوم ہوگا: on my behalf۔ اس طرح ہر مسلمان یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ کے کارِ رسالت کی زنجیر سے ایک کڑی کی طرح منسلک ہو جائے گا اور امت مسلمہ کی تأسیس کی غرض و غایت کو پورا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل ہو جائے گا۔ یہ ہے اصلاحِ معاشرہ کا انقلابی پہلو۔

قرآن حکیم کی متعدد آیات میں اُمتِ مُسلمہ کی تأسیس کی غرض و غایت کو واضح کیا گیا ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۴۳ کے ابتدائی حصہ میں ارشاد ہوا:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ﴾

''اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک بیچ کی اُمت بنایا تا کہ تم لوگوں پر گواہی دینے والے بنو اور رسول تم پر گواہی دینے والا بنے۔''

اسی بات کو سورۃ الحج کی آخری آیت میں ایک دوسرے انداز اور اسلوب سے بیان فرمایا گیا۔ قبل اس کے کہ ہم اس آیت کا مطالعہ کریں' پہلے آیت ۷۵ سن لیجیے جس سے اس آخری آیت کا گہرا ربط و تعلق ہے۔ فرمایا: ﴿اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝۷۵﴾ ''(حقیقت یہ ہے کہ) اللہ (اپنی ہدایات کی ترسیل کے لیے) ملائکہ میں سے بھی پیغام رساں منتخب کرتا ہے اور انسانوں میں سے بھی (رسولوں کا انتخاب فرماتا ہے)۔ بلاشبہ اللہ ہی حقیقی سمیع اور بصیر ہے''۔ یہ بڑی عظیم آیت ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے ارسالِ وحی کا یہ ضابطہ بیان فرمایا ہے کہ وہ اس مقصد کے لیے فرشتوں میں سے کسی کو اپنا رسول' پیغامبر اور ایلچی منتخب فرماتا ہے' جو وحی کو ان حضراتِ قدسیہ تک پہنچاتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ انسانوں میں سے بحیثیتِ نبی و رسول منتخب فرماتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ آخری نبی ہیں اور آپ ﷺ پر نبوت ہمیشہ کے لیے صرف ختم ہی نہیں ہوئی بلکہ نبوت کا اکمال و اتمام بھی ہوا ہے۔ اب قیامت تک کسی نوع کا' نہ بروزی نہ ظلی' کوئی نبی نہیں آئے گا۔ جو بھی اس قسم کا دعویٰ کرے وہ لازماً کاذب اور کافر ہوگا۔ لیکن نوعِ انسانی کی

ہدایت کی ضرورت تو تا قیامِ قیامت باقی رہے گی' لہٰذا ایک تو قرآن مجید کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے لیا: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۝۹﴾ (الحجر) ''یقیناً ہم نے ہی یہ ذکر نازل کیا ہے اور بلاشبہ ہم ہی اس کے محافظ ہیں''—— اور تا قیامِ قیامت قرآنِ مجید کو نبوت کے قائم مقام کا درجہ عطا فرما دیا۔ اب رہا کارِ رسالت' یعنی تبلیغ دعوت' موعظت و نصیحت' تبشیر و انذار' شہادت علی الناس' امر بالمعروف و نہی عن المنکر' تکبیرِ رب اور اقامت و اظہارِ دین کے فرائض منصبی' یہ امت کے سپرد کر دیے گئے۔ گویا ختمِ نبوت کے بعد قیامت تک کے لیے نوعِ انسانی کی ہدایت کے کام پر اُمتِ مسلمہ ایک تیسری کڑی کی حیثیت سے شامل کر دی گئی۔ یہی بات ہے جو سورۃ الحج کی آخری آیت میں فرمائی گئی:

﴿وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ۝۷۸﴾

''اور اللہ کی راہ میں جدوجہد کرو جیسا کہ اس کا حق ہے۔ اُس نے تم کو برگزیدہ کیا ہے اور دین کے معاملے میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ تمہارے باپ ابراہیم کی ملت (کو تمہارے لیے پسند فرمایا)۔ اسی نے تمہارا نام مسلم رکھا اس سے پہلے اور اس قرآن میں بھی' تاکہ رسول تم پر (اللہ کے دین کی) گواہی دے اور تم دوسرے لوگوں پر (اس کی) گواہی دو' اور نماز کا اہتمام رکھو' اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو اور اللہ کو مضبوط پکڑو' وہی تمہارا مرجع ہے' اور کیا ہی خوب مرجع اور کیا ہی خوب مددگار ہے!''

قرآن ہی ''حبل اللہ'' ہے!

اس آیت پر تدبّر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاد اور شہادت علی الناس کی اصطلاحات میں وہ تمام تقاضے آ گئے جن کی ادائیگی بحیثیت امتِ مسلمہ ہر مسلمان پر لازم اور واجب ہے۔ اس کام کے لیے یہاں سہارا ''اعتصام باللہ'' فرمایا گیا۔ اس اجمال کو سورۂ آل عمران میں کھول دیا گیا: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ (آیت ۱۰۳) ''اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لو مل جل کر اور تفرقے میں نہ پڑو!''

اب بھی کچھ اجمال رہ گیا کہ حبل اللہ سے مراد کیا ہے! چونکہ قرآن کی تبیین بھی آپ کے فرائض منصبی میں شامل تھی' لہٰذا آنحضور ﷺ نے اپنے متعدد ارشاداتِ مبارکہ میں اس اجمال کی تشریح وتوضیح فرمادی کہ اللہ کی کتاب قرآن مجید ہی درحقیقت حبل اللہ ہے جس سے اعتصام کا' چمٹ جانے کا' جڑ جانے کا اور جس کو مضبوطی سے تھام لینے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ حجۃ الوداع کے خطبہ کے آخری الفاظ میں آپ کو سنا چکا ہوں: ((وَقَدْ تَرَكْتُ فِيكُمْ مَالَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَهُ اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهِ : كِتَابُ اللّٰهِ)) ''اور میں تمہارے درمیان وہ چیز چھوڑے جارہا ہوں جس کو اگر تم مضبوطی سے تھامے رکھو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے' اور وہ چیز ہے: کتاب اللہ!''

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ایک طویل حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے قرآن کی عظمت و شوکت' اس کے مقام و مرتبہ اور اس کی اہمیت بیان فرما کر قرآن مجید کے متعلق فرمایا: ((.....وَهُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ))(۱۸) ''.....اور یہ قرآن ہی اللہ کی مضبوط رسی ہے''۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں: ((كِتَابُ اللّٰهِ ' حَبْلٌ مَمْدُوْدٌ مِنَ السَّمَاءِ اِلَى الْاَرْضِ))(۱۹) ''اللہ کی کتاب (کو تھامے رکھنا)' یہی وہ مضبوط رسّی ہے جو آسمان سے زمین تک تنی ہوئی ہے''۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں کم وبیش یہی الفاظ وارد ہوئے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((كِتَابُ اللّٰهِ هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَمْدُوْدُ مِنَ السَّمَاءِ اِلَى الْاَرْضِ))(۲۰) ''اللہ کی کتاب ہی اللہ کی رسی ہے جو آسمان سے زمین تک تنی ہوئی ہے۔''

مزید برآں حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلَيْسَ تَشْهَدُوْنَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَاَنَّ الْقُرْآنَ جَاءَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ؟)) قُلْنَا بَلٰى' قَالَ: ((فَاَبْشِرُوْا فَاِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ طَرْفُهٗ بِيَدِ اللّٰهِ وَطَرْفُهٗ بِاَيْدِيْكُمْ' فَتَمَسَّكُوْا بِهٖ فَاِنَّكُمْ لَنْ تَهْلِكُوْا وَلَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَهٗ اَبَدًا))(۲۱)

---

(۱۸) سنن الترمذی' ابواب فضائل القرآن ' باب ما جاء فی فضل القرآن۔

(۱۹) سنن الترمذی' ابواب المناقب' باب مناقب اهل بیت النبی ﷺ۔

(۲۰) صحیح الجامع الصغیر وزیادته' ح : ٤٤٧٣۔

(۲۱) مصنف ابن ابی شیبه' کتاب فضائل القرآن' باب فی التمسك بالقرآن ودیگر کتب احادیث۔

''کیا تم اس کی گواہی نہیں دیتے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' وہ تنہا ہے اور اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور یہ کہ قرآن اللہ کے پاس سے آیا ہے؟'' ہم نے عرض کیا یقیناً۔ تب آپؐ نے فرمایا: ''پس تم خوشیاں مناؤ' اس لیے کہ اس قرآن کا ایک سرا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور ایک سرا تمہارے ہاتھ میں' پس اسے مضبوطی سے تھامے رکھو۔ (اگر تم نے ایسا ہی کیا تو) تم اس کے بعد نہ کبھی ہلاک ہو گے اور نہ کبھی گمراہ۔''

مسلمانوں کا احیاء: احیائے قرآن سے وابستہ!

سورۃ الحج کی آخری آیت کی طرف پھر مراجعت فرمایئے۔ وہاں جہاد اور شہادت علی الناس کے فرائض کا ذکر فرما کر ساتھ ہی ارکانِ اسلام میں سے بطور نمائندہ دو ارکان کے التزام کا حکم عطا فرما دیا اور اس طرح اُمت کی تربیت و تزکیہ کے طریق اور نصاب کا تعین فرما دیا۔ پھر اعتصام باللہ کا حکم دے کر قرآن کو اپنا ہادی و رہنما بنانے کی طرف بھی رہنمائی فرما دی۔ الغرض انقلابی جدوجہد کے پہلے جو دو قدم ہیں' ان کے لیے مبنیٰ و مدار' مرکز و محور' اس کا ذریعہ اور وسیلہ صرف اور صرف قرآن ہے۔ ہمارے زوال' انحطاط' پستی' نکبت اور ذلّت و خواری کا حقیقی سبب درحقیقت اسی قرآن کو ترک کر دینا ہے۔ علامہ اقبال نے جو بات جوابِ شکوہ میں حد درجہ سادہ الفاظ میں یوں کہی تھی کہ ؎

وہ زمانے میں معزّز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر!

اسی بات کا علامہ مرحوم نے نہایت دردانگیز اور حسرت آمیز پیرائے میں اپنے فارسی کلام میں اس طرح اعادہ کیا ہے ؎

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی
شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی
اے چوں شبنم بر زمیں افتندۂ
در بغل داری کتابِ زندۂ

''اے مسلمان! تیری ذلت و رسوائی کا اصل سبب تو یہ ہے کہ تو قرآن سے دور اور بے تعلق ہو گیا ہے' لیکن تو اپنی اس زبوں حالی پر الزامِ گردشِ زمانہ کو دے رہا ہے۔

اے وہ قوم کہ جو شبنم کے مانند زمین پر بکھری ہوئی ہے (اور پاؤں تلے روندی جا رہی ہے!) اُٹھ کہ تیری بغل میں ایک کتابِ زندہ موجود ہے! (جس کے ذریعے تو دوبارہ بامِ عروج پر پہنچ سکتی ہے!)''

گویا اسی ''کتاب زندہ'' سے مسلمانوں کا احیاء وابستہ ہے۔ اصلاحِ معاشرہ ہو' اسلامی نظام کا قیام ہو' اسلامی ممالک کی بقاء اور ان کا استحکام ہو' ان سب کا تعلق احیائے قرآن سے ہے۔ احیائے قرآن ہی مسلمانوں میں اللہ عزوجل' اس کے رسول ﷺ اور اس کی راہ میں جہاد کی محبت کی جوت جگائے گا اور ان کے دلوں میں ایمانِ تازہ کی مشعل فروزاں کرے گا۔ اسی قرآن سے مسلمانوں کا اللہ اور اس کے رسول سے تعلق صحیح بنیادوں پر استوار ہوگا۔ یہ کام نہیں ہوگا تو میرے نزدیک اس سلطنت خداداد پاکستان میں صحیح معنی میں اسلام کا وہ کام نہیں ہوگا جو مطلوب اور پیش نظر ہے۔ چند نمائشی اور ظاہری کام شاید ہو جائیں۔

یہی پیغام علامہ اقبال مرحوم پچاس ساٹھ سال قبل دے گئے ہیں کہ ملّت کے تن مردہ میں انقلابی رُوح پھونکنے اور اس میں عمل کا داعیہ پیدا کرنے کے لیے آبِ حیات کا چشمہ و منبع دراصل قرآن ہی ہے:

بر خور از قرآں اگر خواہی ثبات
در ضمیرش دیدہ ام آبِ حیات
می دہد ما را پیامِ لَاتَخَفْ
می رساند بر مقامِ لَاتَخَفْ
گوہر دریائے قرآں سفتہ ام
شرحِ رمزِ صبغۃ اللّٰہ گفتہ ام
فکرِ من گردوں مسیر از فیضِ اوست
جوئے ساحل ناپذیر از فیضِ اوست
پس بگیر از بادۂ من یک دو جام
تا درخشی مثلِ تیغ بے نیام!

''(اے مسلمان) اگر دوام و ثبات اور قوت و استحکام کا طالب ہے تو قرآن کے سامنے دست سوال دراز کر۔ اس لیے کہ مجھے قرآن ہی کے مخفی چشموں میں آبِ حیات کا

سراغ ملا ہے!۔ یہ ہمیں بے خوفی کا پیغام ہی نہیں دیتا' بالفعل اس مقام تک پہنچا بھی دیتا ہے جہاں نہ خوف باقی رہتا ہے (نہ حزن!)۔ میں نے قرآن کے بحر بیکراں کے موتی بیندھ لیے ہیں اور ''صبغة اللّٰه'' کے اسرار و رموز کی شرح بیان کر دی ہے۔ میرے فکر کی یہ بلندی اور گردوں نوردی سراسر قرآن ہی کے فیض سے ہے اور اسی کے طفیل میرے خیالات میں بحر بیکراں کی سی وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ پس (اگر خدا توفیق دے تو) میری شراب کے ایک دو جام چڑھا یعنی میرے فکر اور پیغام سے سرشار ہو کر آمادۂ عمل ہو جا تا کہ تو شمشیر برہنہ کے مانند چمکنے لگے!

ایک مقام پر فرماتے ہیں ؎

از یک آئینی مسلماں زندہ است
پیکرِ ملّت ز قرآں زندہ است
ما ہمہ خاک و دلِ آگاہ اُوست
اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست
چوں گہر در رشتۂ اُو سفتہ شو!
ورنہ مانندِ غبار آشفتہ شو!

''وحدتِ آئین ہی مسلمان کی زندگی کا اصل راز ہے اور ملّتِ اسلامی کے جسدِ ظاہری میں روحِ باطنی کی حیثیت صرف قرآن کو حاصل ہے۔ ہم تو سرتاپا خاک ہی خاک ہیں' ہمارا قلب زندہ اور ہماری روح تابندہ تو اصل میں قرآن ہی ہے۔ اس کو مضبوطی سے تھام لو' کہ یہی حبل اللہ (اللہ کی رسی) ہے۔ (اے ملتِ اسلامی! اب بھی وقت ہے کہ تو) اپنے آپ کو موتیوں کی طرح قرآن کے رشتے میں بیندھ اور پرو لے' ورنہ پھر اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں کہ خاک اور دھول کے مانند پریشان اور منتشر (اور ذلیل و خوار) رہ!''

اسلامی انقلابی جماعت کا قرآن میں ذکر

انقلابی نظریہ اور اس کے مطابق تربیت کے ساتھ ساتھ تنظیم کا مرحلہ چلتا ہے۔ چونکہ تنظیم کے بغیر انقلابی جدوجہد تو دور کی بات ہے کوئی اصلاحی' رفاہی' فلاحی' تعلیمی اور سماجی نوع کے اجتماعی کام بھی انجام نہیں پا سکتے' اسی لیے اسلامی انقلابی جماعت کو قرآن نے ''حزب اللہ'' قرار دیا ہے اور اس کے لیے ''اُمت'' کا لفظ بھی استعمال فرمایا ہے۔ حزب (party) کسی اعلیٰ مقصد کی انجام دہی کے لیے وجود میں آتی ہے۔ اسی طرح اُمت کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ

کسی امرِ جامع، کسی قدرِ مشترک، کسی نظریہ (ideology) کو قبول کر لیں تو اُن افراد کا مجموعہ 'اُمت' قرار پائے گا۔ یہی سبب ہے کہ قرآن مجید نے مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ کے لیے لفظ ''قوم'' استعمال نہیں کیا اور نہ حدیث میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ دنیا میں ہمیشہ سے قومیت کا تصور یہ چلا آ رہا ہے کہ وہ یا نسل کی بنیاد پر بنتی ہے یا علاقہ، ملک، وطن اور زبان کی بنیاد پر۔ یہ تصور ہمارے دین کے تصورات سے بالکل متضاد اور متناقض ہے۔ اسلام کا اصل الاصول ''اخوت'' ہے۔ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے خواہ وہ مشرق کا رہنے والا ہو یا مغرب کا، خواہ وہ گورا ہو یا کالا، وہ چاہے کسی نسل، کسی قوم سے تعلق رکھتا ہو، کسی ملک کا رہنے والا ہو اور چاہے وہ کوئی زبان بولتا ہو۔ چنانچہ سورۃ الحجرات میں فرمایا: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ﴾ (آیت ۱۰) ''بالیقین تمام اہلِ ایمان آپس میں بھائی بھائی ہیں''۔ اس اصل الاصول کی بھی علامہ اقبال نے خوب ترجمانی کی ہے۔ ''ترانۂ ملی'' کے نام سے ان کیبڑی مشہور نظم ہے، جس کا پہلا شعر ہے ؎

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا!

بانگ درا میں ''طلوعِ اسلام'' کے عنوان سے ایک طویل نظم کو علامہ کی اُردو ملی شاعری کے نہایت فصیح و بلیغ 'خلاصے' کا مقام دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ علامہ فرماتے ہیں ؎

یہی مقصودِ فطرت ہے، یہی رمزِ مسلمانی
اُخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی!
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی!
میانِ شاخساراں صحبتِ مرغِ چمن کب تک
ترے بازو میں ہے پروازِ شاہینِ قہستانی!
گماں آباد ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا
بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی!
مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا؟ زورِ حیدرؓ، فقرِ بوذرؓ، صدقِ سلمانیؓ!

ہوئے احرارِ ملّت جادہ پیما کس تجمل سے
تماشائی شگافِ در سے ہیں صدیوں کے زندانی!
ثباتِ زندگی ایمانِ محکم سے ہے دُنیا میں
کہ المانی سے بھی پائندہ تر نکلا ہے تورانی!
جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پر روح الامیں پیدا!

بانگ درا ہی میں ''وطنیت'' کے عنوان سے علامہ نے وطنی قومیت کی نفی میں جو معرکۃ الآراء نظم کہی ہے، بے اختیار اس کا ایک بند یاد آ رہا ہے۔

یہ بُت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے
غارت گر کاشانۂ دین نبویؐ ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بُت کو ملا دے!

اسی طرح اقبال نے اپنی نظم ''مذہب'' میں کہا:

اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ!
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری!

اس ضمن میں علامہ کے فارسی کلام سے بھی دو شعر پیش کرتا ہوں۔

کُلُّ مُؤمن اخوۃٌ اندر دلش
حریت سرمایۂ آب و گلش
نا شکیب امتیازات آمدہ
در نہادِ اُو مساوات آمدہ

''اس کے (یعنی بندۂ مؤمن کے) دل میں یہ حقیقت جاگزیں ہے کہ ''تمام اہلِ ایمان

آپس میں بھائی بھائی ہیں!'' اسی طرح جذبہ حریت بھی اس کے ضمیر میں رچا بسا ہوا ہے' وہ (نسلی' لسانی یا علاقائی) امتیازات سے بالکل ناواقف ہے اور مساوات اس کی سرشت میں موجود ہے!''

جماعت اور تنظیم کی ضرورت و اہمیت

یہ تمام معروضات میں نے اس لیے پیش کی ہیں کہ قرآن کے انقلابی فکر اور نظریے سے چہار دانگ عالم کو روشناس اور واقف کرانے اور اسلامی انقلاب کے لیے جماعت' تنظیم اور حزب (پارٹی) کا وجود و قیام لابدمنہ ہے' لازم ہے' واجب ہے۔ جماعت کے بغیر کوئی اجتماعی کام انجام دینا بھی محال ہے تو اس کے بغیر اسلامی و قرآنی انقلاب کا فریضہ کیسے انجام دیا جا سکتا ہے؟ پھر جماعت و تنظیم بھی انجمن اور اداروں کی طرز کی ڈھیلی ڈھالی مطلوب نہیں ہے' بلکہ وہ جماعت درکار ہے جس کی تعلیم ملتی ہے نبی اکرم ﷺ کے اس تاکیدی فرمان میں:

((اَنَا آمُرُکُمْ بِخَمْسٍ' اَللّٰہُ اَمَرَنِیْ بِھِنَّ : بِالْجَمَاعَۃِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ وَالْھِجْرَۃِ وَالْجِھَادِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ))(۲۲)

مسلمانو! میں تم کو پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں' اللہ نے مجھے ان (باتوں) کا حکم دیا ہے: التزامِ جماعت کا (حکم)' سننے کا (حکم)' ماننے کا (حکم)' ہجرت (راہِ خدا میں ترکِ وطن) کا اور اللہ کی راہ میں جہاد کا (حکم)۔''

قرآنِ مجید اور دین کی مجموعی تعلیمات سے لزومِ جماعت کے لیے متعدد استشہاد پیش کیے جا سکتے ہیں' لیکن میں دو آیات پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۱۰ میں واضح طور پر فرمایا:

﴿کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ ط﴾

''(اے اہلِ ایمان!) ہم نے تم کو ایک بہترین امت بنایا ہی اس مقصد کے لیے ہے کہ تم لوگوں کو نیکی کا حکم دو' برائیوں سے روکو اور اللہ پر پختہ ایمان رکھو۔''

گویا امر بالمعروف و نہی عن المنکر اس امت کا منشور (manifesto) ہے۔ اس کام کی انجام دہی اس کا فرض منصبی ہے۔ دنیا میں ''اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ'' کا عملی مظاہرہ اُمت کو کرنا ہے۔ اسی

(۲۲) مسند احمد' کتاب مسند الشامیین' باب حدیث الحارث الاشعری عن النبی ﷺ۔

کی ترجمانی علامہ نے ''شکوہ'' میں یوں کی ہے:

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے
نوعِ انسانی کو غلامی سے چھڑایا ہم نے
تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے
تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے

اور ایک اگلے بند کے آخری شعر میں کہتے ہیں ؎

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے، جام رہے؟

(ان اشعار میں اصل میں تو متقدمین کا تذکرہ ہے۔ اس بند میں ان کے کارناموں کو بطور تلمیح بیان کیا گیا ہے۔ لیکن ہمارا جو حال ہے، اس کا نقشہ دیکھنا ہو تو علامہ کا ''جوابِ شکوہ'' پڑھیے۔)

اگر اُمت بحیثیت اُمت اپنے فرضِ منصبی کی انجام دہی سے غافل ہو جائے تو کیا کیا جائے؟ اس کا حل بھی سورۂ آل عمران کی آیت ۱۰۴ میں بیان فرما دیا گیا:

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝﴾

''اور تم میں سے ایک جماعت ایسی ضرور ہونی چاہیے جو خیر کی طرف دعوت دے، نیکی کا حکم دیتی رہے اور بدی سے روکتی رہے۔ اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''

اس آیت کے آخر میں حصر کا اسلوب ہے، یعنی حقیقی فلاح پانے والے اس گروہ، جماعت، تنظیم کے لوگ ہوں گے جن کا مقصدِ حیات ہی دعوت اِلی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہوگا۔

انقلاب کے تکمیلی مراحل

میں نے مقدور بھر کوشش کی ہے کہ قرآنی انقلاب اور اصلاحِ معاشرہ کا انقلابی پہلو واضح طور پر آپ کے سامنے بیان کر دوں۔ ساری گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ انقلابِ محمدی ﷺ کے تین مراحل ہیں جو ہر انقلابی جدوجہد کے لیے ناگزیر ہوتے ہیں۔ پہلا مرحلہ انقلابی نظریہ و فکر ہے اور اس کے لیے ہمارے پاس قرآن مجید ہے۔ دوسرا مرحلہ ہے اس انقلابی نظریہ کے مطابق جدوجہد کے لیے ایک تنظیم کا قیام۔ اس کے لیے یہ اصول بیان کر دیا گیا کہ یہ تنظیم ٹھیٹھ اسلامی اصولوں کے مطابق سمع و طاعت (discipline) والی تنظیم ہو۔ تیسرا مرحلہ تربیت ہے

اور اس کے لیے اسلام نے ہمیں عبادات اور اخلاقیات و معاملات کا ایک مکمل نظام اور نصاب دیا ہے۔

اس سے آگے کے تین تکمیلی مراحل ہیں اور اُن کا جامع عنوان ہے: ''تصادم اور کشمکش'' یا جہاد و قتال فی سبیل اللہ۔ تنظیم کا مرحلہ پہلے دو مرحلوں سے بھی مربوط ہے اور ان تکمیلی تین مراحل سے بھی۔ ان تکمیلی مراحل میں سے پہلا مرحلہ ہے: صبر و مصابرت اور ثبات و استقامت کا۔ جیسے سورۃ الاحقاف میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا﴾ (آیت ۱۳) ''بے شک جن لوگوں نے اقرار کیا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر جم گئے''۔ بعینہٖ یہ الفاظ سورۂ حٰمٓ السجدۃ کی آیت ۳۰ میں بھی آئے ہیں۔

ہر انقلابی فکر و نظریہ اور دعوت کو رائج الوقت جابرانہ اور استحصالی نظام کے طنز و استہزاء، جو روستم اور ظلم و عدوان کا بتدریج نشانہ بننا پڑتا ہے۔ اس مرحلے کے لیے ہدایت یہ ہوتی ہے: کُفُّوۡۤا اَیۡدِیَکُمۡ کہ اپنے ہاتھ بندھے رکھو۔ ماریں کھاؤ، ظلم کی چکی میں پستے رہو لیکن جوابی کارروائی نہیں کر سکتے، ہاتھ نہیں اُٹھا سکتے۔ اس طرح ایک طرف تو اس انقلابی جماعت کی تربیت اور آزمائش ہوتی ہے اور دوسری طرف عامۃ الناس کے دل اس دعوت کی طرف ملتفت ہونے لگتے ہیں۔ یہ دعوت ان کی ہمدردیاں غیر محسوس طریق پر حاصل کرتی رہتی ہے۔ اس کو میں صبرِ محض (passive resistance) سے تعبیر کیا کرتا ہوں۔

دوسرا مرحلہ وہ ہوتا ہے جب اس انقلابی جماعت کو قوت حاصل ہو جاتی ہے اور وہ جوابی کارروائی کرنے کی پوزیشن میں آ جاتی ہے تو یہ جماعت رائج نظام کی کسی دکھتی رگ کو چھیڑتی ہے۔ اس عمل کو میں اِقدام (active resistance) سے تعبیر کرتا ہوں۔ تیسرا اور آخری مرحلہ ہوتا ہے مسلّح تصادم (armed conflict) کا۔ یہی وہ مرحلہ ہے کہ جس کے متعلق اللہ تعالیٰ سورۃ الصّف میں فرماتا ہے کہ:

﴿اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیۡنَ یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِہٖ صَفًّا کَاَنَّہُمۡ بُنۡیَانٌ مَّرۡصُوۡصٌ ﴿۴﴾﴾

''اللہ کو تو محبوب ہیں وہ بندے جو اُس کی راہ میں صفیں باندھ کر قتال کرتے ہیں، جیسے کہ وہ سیسہ پلائی دیوار ہوں۔''

جس کو علامہ اقبال نے یوں تعبیر کیا ہے کہ:

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند!

میں نے کتاب وسنت کا جو تھوڑا بہت مطالعہ اور اس میں غور وفکر کیا ہے اس کی روشنی میں ۱۹۷۰ء ہی میں اس نتیجہ پر پہنچ گیا تھا کہ ان فرائض دینی یعنی تکبیرِ رب' اقامتِ دین' اظہارِ دین الحق علی الدّین کلّہ کے لیے جو جماعت بنے گی اس کی اساس بیعت پر ہوگی۔ چنانچہ میں نے جو جماعت تنظیم اسلامی کے نام سے قائم کی ہے اس کی بنیاد بیعت پر رکھی ہے۔ میں ہر اُس شخص سے تبادلۂ خیال اور افہام وتفہیم کے لیے ہر وقت تیار ہوں جو کتاب وسنت کے دلائل سے ثابت کر دے کہ اس مقصد کے لیے بیعت کے علاوہ بھی کسی دوسرے طریقہ کار کے لیے قرآن و حدیث سے رہنمائی ملتی ہے۔ میں نے اپنے فہم کے مطابق طریق بیعت اختیار کیا ہے تو اُسے میں پورے شرحِ صدر کے ساتھ کتاب وسنت سے ماخوذ ہی نہیں بلکہ عین اس کے مطابق یعنی مسنون سمجھتا ہوں اور اسی پر جازم ہوں۔

میں ان تکمیلی مراحل کے اس اجمالی بیان پر اکتفا کرتے ہوئے آج کی اس طویل تقریر کے خلاصے پر اپنی گفتگو ختم کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ انقلابی دعوت اسی قرآن کی بنیاد پر اُٹھے۔ اسی قرآن کے ذریعہ سے تزکیہ وتربیت ہو۔ اسی قرآن کی تعلیم کا صحیح اور مؤثر انتظام ہو۔ یہ ہیں درحقیقت اس انقلاب کے ناگزیر لوازم جن کو اسلامی انقلاب کہا جاتا ہے' اور ان کے بغیر نہ انقلابِ اسلامی آئے گا اور نہ ہی اصلاحِ معاشرہ کی کوئی تحریک کامیاب ہوگی۔ تمام کوششیں ٹھٹھر کر رہ جائیں گی' وہ اپنے ماحول سے غذا ہی نہیں پائیں گی' اور حال یہ ہوگا کہ ؎

آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں
اور ہو جائے تو مرجاتی ہے یا رہتی ہے خام!

اقول قولی هذا واستغفرا اللّٰه لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات○○